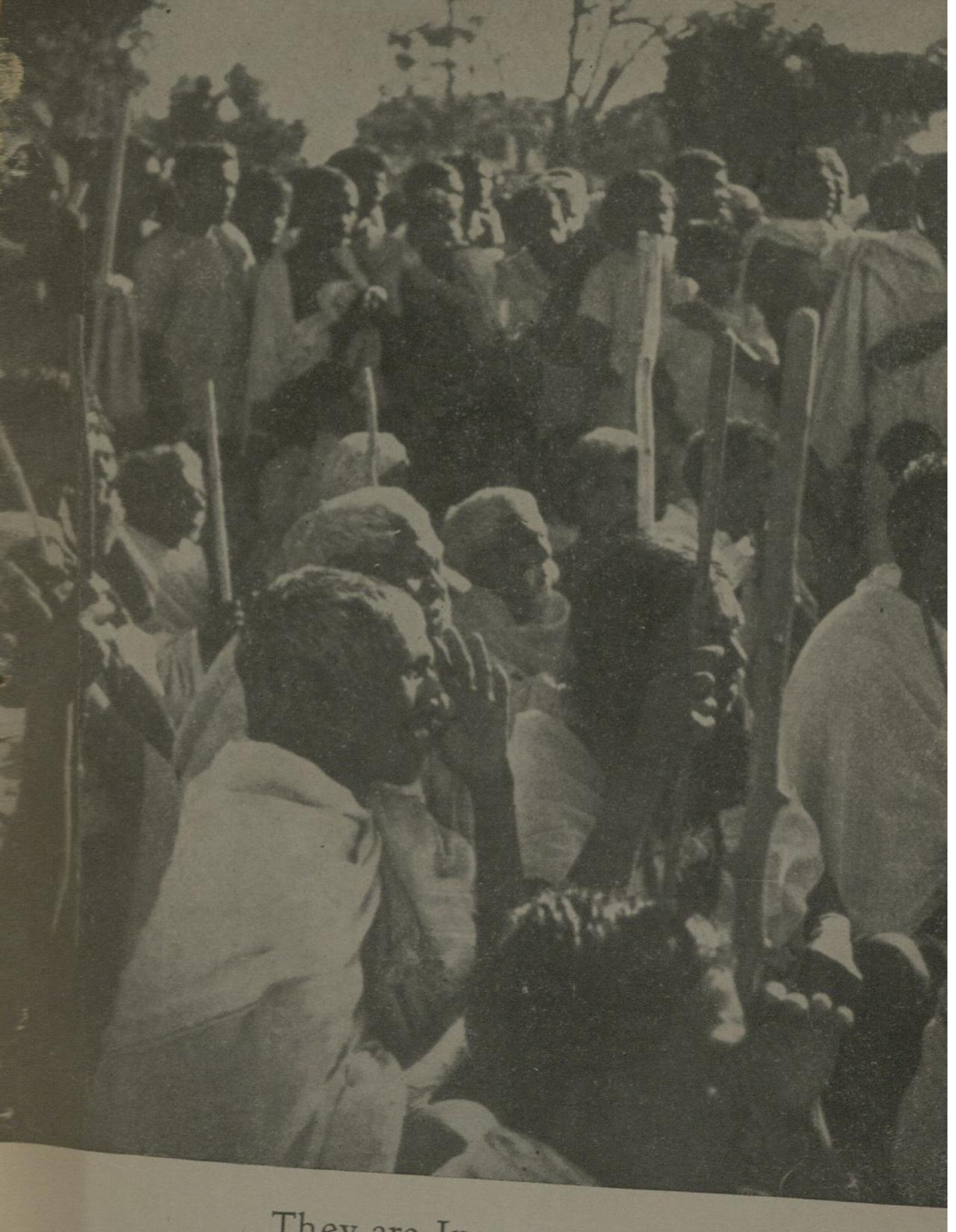
گائے جا ہندوستان

دیوندر ستیارتھی



They are Insurgents........

گائے جا ہندوستان

مصنف کی دوسری کتابیں

اُردو

مَیں ہُوں خانہ بدوش

نئے دیوتا

اَور بنسری بجتی رہی

پنجابی

گِدّھا

دیوا بلے ساری رات

کنگ پوش

دھرتی دِیاں واجاں

ہندی

دھرتی گاتی ہے

انگریزی

Meet My People

The Plough and the Drum

Songs of the Indian People

دیویندر ستیارتھی

گائے جا ہندوستان

سنگم پبلشرز لمیٹڈ • لاہور

پطرس کے نام

— جس نے لوک گیت کو دوبارہ زندہ کیا

افتتاحیہ

"گائے جا ہندوستان" دیوندر ستیارتھی کے ان گیتوں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ہند گردی کے بعد جمع کئے ہیں اور جنہیں آپ نے مضامین کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ صرف لوک گیتوں سے کسی خاص طبقے یا علاقے کے لوگوں کی رسوم و روایات کا اندازہ کرنا مشکل تھا لیکن ان مضامین میں جب ہم دُکھ اور سُکھ کے گیت گاتے ہوئے ہندیوں کو ایک مکمل تصویر میں دیکھتے ہیں تو نہ صرف ہمارے معاشرتی علم اور علمِ نوعِ انسانی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اس مخصوص گیت کا سحر بھی ہمارے نزدیک دوچند ہو جاتا ہے۔ اُن کے سادہ سے سادہ مضمون پڑھتے ہوئے بھی ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے گویا ہم مذکورہ کرّے میں سانس لے رہے ہیں —— ابھی کوئی مدراسی ماہی گیر 'پونو سامی چیٹی' بحرِ ہند کے وسیع اور متلاطم پانیوں پر اپنا جال پھیلاتے ہوئے مچھلیوں کو بُلا رہا ہے ——

کوڑی دا' کوڑی دا کا و لالی

کوٹ مِٹ تِل وینڈم کا و لالی

مِل کر آؤ' مِل کر آؤ (مچھلیو) اومیرے محافظ! مچھلیوں کی ٹولی بنا کر (میرے روبرو) دھکیل دینی چاہئے ..... تو اُس وقت ہمارے سامنے ایک ہندوستانی آجاتا ہے' کالا بھجنگ' جس کے جسم پر لنگوٹی اور سر پر چُٹیا کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جسے

آپ نے لانگ مینز گرین اینڈ کمپنی یا بلیکی اینڈ سنز کی انگریزی پرائمروں میں دیکھا ہوگا لیکن اب اس کی آواز بھی آپ کے کانوں میں آرہی ہے —— کوٹ مٹ ٹل ویٹڈم کا ولالی۔ ٹ اور ڈ کے حروف کی تکرار کانوں کو ناگوار معلوم ہو رہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کول تار کے کسی خالی خولی ڈھول میں کسی نے کنکر ڈال دیئے ہیں اور اسے سڑک پر لڑھکا دیا ہے .... پھر اسی مختلف النوع زندگی میں ہم بارہ بنکی کے دھوبی گھاٹ پر پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں دھوبی معمول کی طرح کپڑے دھو رہا ہے اور گا رہا ہے

دھوبی کے چھبے چار مہیریا!

اور تال چھیئو رام چھیئو، چھیئو رام چھیئو! یعنی دھوبی کو چار مہیریا (بیویاں) جنہیں...
... چھیئو! ...... بھات کے لئے، گھاٹ کے لئے، گھاٹ کے لئے ......

....

آج سے ستر اسی سال پہلے والٹ وھٹ مین نے امریکا کی آواز[له] سنی تھی۔ اس نے بھی گھاٹ پر دھوبی کو گاتے ہوئے سنا۔ گھر میں سینے پرونے کا کام کرتے ہوئے گھر کی بیوی کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ اس وقت لنکن اور گارفیلڈ نے امریکیوں کے لئے ترقی کی شاہراہیں کھول دی تھیں۔ شمالی اور جنوبی ریاستوں کی جنگ ختم ہو چکی تھی —— اور امریکا فراغت کے گیت گا رہا تھا۔ اس اجتماعی گیت کو ہر کسی کے کان نہیں سنتے اس کے لئے ایک اجتماعی دماغ اور ایک اجتماعی دل کی ضرورت ہے کیونکہ اس دل اور دماغ کو قوم کی عسرت اور فراغت کا ترجمان ہونا ہے یہ اس اجتماعی

له "I hear America Singing" - Walt whitman

دماغ کی قابلیت ہے کہ وہ دھوبی کے گیت، بیوی کے گنگنانے، لیور پر ہاتھ رکھے ہوئے مزدوروں کی آواز کو ملا لے اور اس آمیزش Synthesis کے بعد اپنی استعداد کی مدد سے ایک ایسی آواز سنے جسے ہم قوم کی آواز کہہ سکیں۔ راس کماری سے لے کر درہ خیبر تک اور تمو گاؤں سے لیکر کراچی تک گھوم پھر کر ایک کڑی ریاضت کے بعد دیوندر ستیارتھی نے ایک اجتماعی دل اور دماغ پیدا کیا ہے جو کہ متنوع راگ اور راگنیوں کو ملا کر قوم کا راگ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اُس کے اور اجتماع کے دل کی دھڑکن ایک ساتھ سنائی دیتی ہے اور یہ سب کچھ آسان نہ تھا۔ بعض وقت یوں معلوم ہوا کہ منزل کے سامنے آن کر تھک گئے —— "اپنی اقتصادی حالت پر غور کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنے ماضی پر جھنجلاہٹ ہوئی" —— ایک بار پھر۔ گویا اس سے پہلے بھی متعدد بار ایسی جھنجلاہٹ پیدا ہوئی ہوگی اور خانہ بدوش ادیب کو ایسی آزمائشوں سے گذرنا پڑا ہوگا۔ اس بار کی یہ کیفیت "آخری تنکا" ثابت ہو سکتی تھی —— "ناحق میں لوک گیتوں کی تلاش میں بھٹکتا رہا، ناحق گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کو آدرش بنائے عمر برباد کرتا رہا" لیکن اُس کے بعد ان کے اجتماعی دل سے آواز آئی "ان عالمگیر مصیبتوں کے پیش نظر میری تکلیفوں کی اہمیت کیا ہے"؟

اس قسم کی ریاضت اور نفس کشی اپنا بدل آپ ہے۔ جہاں ستیارتھی کو ان گیتوں کی پاداش میں اتنی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا وہاں انہوں نے اس سے ایک خاص قسم کا حظ بھی اٹھایا۔ لیکن ہم ترکیب "ایک خاص قسم" سے بہت پرے نہیں جا سکتے کیونکہ اس میں مرگ انبوہ کا "جشن" شامل نہیں ہے اور یہ حظ نفس کوشی کی حدود کو بھی نہیں چھو سکتا کیونکہ جو آواز ستیارتھی کے Synthetic ذہن کو سنائی دی وہ اُس

آواز سے بہت مختلف تھی جو دھٹ مین نے سُنی ستیارتھی نے اپنے ملک کے طول و عرض میں گھوم کر دیکھا تو انہیں ہرے بھرے کھیت کم ہی دکھائی دیئے۔ صرف اتنے ہرے بھرے کھیت نظر آئے جو "ہرے بھرے" کے متعلق ہمارے تصوّر کو زندہ رکھ سکیں ورنہ انہوں نے ان کھیتوں میں بھوک ہی اُگتے ہوئے دیکھی ع

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

....

بھکھیا کے مارے برھا بسریگا
بھول گئی کجری کبیر
دیکھی کے گوری کے موہنی سورتی'
اُٹھے نہ کرجوا مال پیر

(گائے جا ہندوستان صفحہ ۲۱)

—— بھوک کے مارے برھا بسر گیا۔ کجری اور کبیر گیت بھی بھول گئے۔ گوری کی موہنی صورت دیکھ کر اب کلیجے میں درد نہیں اٹھتا۔ یہاں دمشق کے عشق کے مقابلے میں برھا ہے۔ برھا پہلے ہی شعر کی ایک ایسی صنف ہے جو دُکھ سے تعلق رکھتی ہے۔ اور فراق کے تصورات اپنے ذہن میں لاتی ہے۔ وہ عشق محض سے زیادہ پُر درد ہے اس لئے برھا کا بسر جانا ایک بہت بڑی قحط سالی کی علامت ہے۔ پھر ہندوستان کے عشق میں کجری کے ساتھ کبیر بھی شامل ہے۔ کجری کو انسان بھول جاتا ہے کبیر مذہب اور خدا کو آسانی سے نہیں بھولتا۔ چاروں طرف سے مایوس ہو کر وہ آسمان کی طرف مُنہ

اُٹھا دیتا ہے لیکن اس برھا کے اجتماعی مصنف کو اس پر بھی توکل نہیں رہا۔ اور ابھی یہ برہموں کا برھا کانوں میں گونج رہا ہے تو بندھیل کھنڈ سے "پھاگ" کی آواز سنائی دیتی ہے۔

گو انہوں ھتے سو ہو گئے
بھُس لے گئی اندوار
ٹوٹے میں ٹموا گئے
باڑھی میں کھگبار
جری بانے میں لکھ دو دوئی جوبنا!

—— گیہوں تھا وہ ختم ہو گیا۔ بھُوسے کو جھکڑ اُٹھا کر لے گیا۔ ٹوٹے (گھاٹے) میں بیل بک گئے، بنیئے کا اناج لوٹانے میں کھگبار (ہنسلی) چلی گئی۔ (اب اجری بانے (جرمانے) میں میری دو نو چھاتیاں لکھ کر لے جاؤ ......" پھاگ" کا لغوی مطلب ہے۔ خوشی، آنند، عیش اور راگ رنگ۔ پھاگ ہولی کے دنوں میں کھیلا جاتا ہے کہ خوشی کے اظہار کا ذریعہ ہے لیکن اب بندھیلکھنڈ کے پھاگ بیہاگ بن گئے ہیں اور دنیا کے اس حصے کی انسانیت اس قعرِ عمیق میں گر چکی ہے کہ وہ اپنے دونو جوبن پیش کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔

کہیں "سہرائی" ناچ کر جنم بھومی سنتھال دیش میں اساڑھ میں جل برس جاتا ہے ساون میں پانی کی کمی ہو جاتی ہے۔ کندھے پر کدال رکھے دہقان کھیت میں کھڑا نظر آتا ہے اور اس وقت وہ روتا روتا بھی رام رام کئے جاتا ہے۔ (صفحہ ۹۷) جہاں کہیں بھی تھوڑا سا سکھ ہے اس پر دکھ کی چھایا نظر آتی ہے۔ قحط ایک معمول ہو گیا ہے۔

حتیٰ کہ دھرتی کے ایک لال کا نام ڈکال ہے جس کا مفہوم ہے ــــ قحط ــــ گونڈوں کے بن بھجنوں میں جگہ جگہ یہ ڈکال بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان گونڈوں کی تہذیب آریاؤں کی تہذیب سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ گونڈ آریاؤں کے آنے سے پہلے مغربی ہند میں دراوڑوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ ہوتے ہوتے یہ لوگ وسط ہند میں پہنچ گئے اور یہاں انہوں نے اپنا تسلط جمالیا اور چودھویں صدی میں انہوں نے کچھ ریاستوں کی بنیاد رکھی جو مجموعی طور پر گونڈوانہ کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ ان ریاستوں کے راجا اپنی پرجا کا خیال رکھتے تھے۔ "پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا" کے عقیدے پر عامل تھے "تب لکشمی مہان تھی" جنتا کے پاس دولت کی فراوانی تھی۔ راجا اپنے ہی تو تھے۔ عیاشی کرتے تھے لیکن ان کی دولت گونڈوانے ہی میں تقسیم ہوتی تھی اور اس سے باہر نہیں جاتی تھی۔ مرہٹوں کے حملوں کے بعد انگریزی عمل داری آئی اور ملک بھر میں لوٹ کھسوٹ شروع ہوئی۔ براہ راست گونڈوانے کو تاراج نہ کیا گیا لیکن مہذب بنانے کا معمول شروع ہو گیا۔ سرمائے دارانہ ذہنیت کو تشفی ہوئی تو میدانی علاقوں سے کچھ ہوشیار کلال آئے اور دیمک کی طرح گونڈوں کی کمائی چاٹ گئے۔ جب بیتول، چھندواڑہ، منڈلا اور چاندہ میں ان کی ریاستیں قائم تھیں۔ تب گونڈوں کے دادریہ گیتوں میں فراغت اور محبت مترنم نظر آتی تھی ــــ

جی چاہتا ہے تو اپر روٹی سینکا کروں
تجھے سامنے بٹھا کر تیرا منہ دیکھا کروں

یعنی روٹی بھی ہے اور اُسے "سینکا کروں" کی فرصت اور پھر سامنے بٹھا کر منہ دیکھتے رہنے کی فراغت۔ جھونپڑیوں کی جگہ محلوں کا بھی ذکر آتا ہے۔

اونچی اٹاری ہے، اونچی ہے کھڑکی

نین تو لگا دے ذرا' او دوست' میں راجا کی لڑکی ہوں.....

اور ظاہر ہے اس اٹاری پر جھانکتے ہوئے گونڈ نوجوان کو اپنی پگڑی کا خیال نہ ہوتا" اور راجا کی لڑکی اُسے "نین لگانے" کی دعوت دیتی۔ لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے، ان کے گیت اب مغموم نغموں کے جنم داتا بن چکے ہیں ——

"بئی ہر" کے بازار میں گڑ نہیں ملتا

"کرما" ناچ میں گانے والوں کا سُر نہیں ملتا

بھوک کیا کم تھی اس پر افلاس کا عالم کہ تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں ملتا۔ چنانچہ ایک دادریہ کا مفہوم یہ ہے کہ گاؤں کا زمیندار بہت غریب ہو گیا ہے۔ اس نے اپنی بہن کو بیچ دیا ہے اور ایک دھوتی خرید لی ہے........ اور افلاس اور قحط کے سائے لمبے ہوتے جا رہے ہیں!

....

ہمارے گیتوں میں "ہرا بھرا" عنصر کم ہے، سرحدی لوگوں' بلوچیوں' راجپوتوں اور ناگاؤں کے رزمیہ گیت پیکار سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہن بھائیوں کے گیت میں ایک ہی جذبہ کار فرما ہے اور وہ بھائی بہن کی محبت کا جذبہ ہے۔ لوریاں عام طور پر واتسلیہ رس میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔ البتہ کہیں کہیں سہرا ہے ان میں فراوانی کی جھلک مل جاتی ہے ——

—— بابا ہُنے آوے گا' کپاہ دی پنڈ لیا ؤ گا (بابا ابھی آئیگا اور کپاہ کی گٹھڑی لائے گا)

....

کھڑولیوں کڈھاں کھنڈ' آلیوں کڈھاں گھیو (کھڑولے سے چینی نکالتی ہوں اور طاق سے گھی

لیکن یہ بھی پنجاب کے زراعتی ملک تک محدود ہے ——— 'باواتیرا ہفت ہزاری واداصوبہ دار' مغلیہ عہد کی یادگار ہیں۔ راجپوتانہ کے دوہے اور سورٹھے جو آپ بھرنیش کے دنوں سے ہم تک ہیم چندر کی وساطت سے پہنچے ہیں سرتاسر محبت اور رومان میں بسے ہوئے ہیں ———

بابیہیا نِل پنکھیا' داڑھت دے دے لون
پیو میرو میں پیو کی' تو پیو کہے سو کون
——— ارے پپیہے تو زخموں پر نمک کیوں چھڑکتا ہے؟
پی (پریتم) میرے ہیں اور میں پریتم کی ——— تُو کون جو پی پی پکارتا ہے
(راجپوتانہ کے دوہے صفحہ ۱۹۱)

لیکن آج کے دوہے موجودہ راجپوتانے کی معاشرت کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں حقایق اور تلخی کا رنگ نظر آنے لگا ہے۔ اس دیش میں پانی کی بیحد قلت ہے اور اڑوس پڑوس کے ملکوں کی کنواریاں اس دیس میں بیاہے جانے سے ڈرتی ہیں کیونکہ ان کی عمر عزیز پانی کی گاگریں اٹھاتے اٹھاتے گذر جائے گی۔ انہیں ایسے دیس سے کوئی محبت نہیں

بالوں بابا دیسڑو' پانی سندی تات
پانی کیرے کارنے' پروچھنڈے ادھ رات
اے دادا! میں اس دیس کو جلا کر راکھ کردوں' جہاں پانی کی خاطر اپنا محبوب آدھی رات کے وقت ہی الوداع کہہ جاتا ہے!

عوام کی شاعری خوبصورت ہے' بہی خوبصورت۔ خواہ اس میں حلاوت ہو

اور خواہ تلخی۔ کیونکہ ان کے اظہار میں انتہائی سادگی سے کام لیا گیا ہے اور بغیر لاگ لپٹ کے روئیداد بیان کر دی گئی ہے۔ سپے اور انمیلوں کی بظاہر تک بندی میں جو اشارے اور مطالب پنہاں ہیں ان سے ہمیں ان گیتوں کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ لبوں سے نکلتے ہی دل اور جگر تک اُترتے چلے جاتے ہیں اور ہمیں دیہات کے لوگوں کی سادگی ان کی چھوٹی چھوٹی آسوں اور پیاسوں کا احساس ہو جاتا ہے۔ انہیں پڑھ کر "سلطانی اور عیاری" کی بحث ہمارے لئے ناممکن ہو جاتی ہے۔ ان گیتوں کے بار بار مطالعے سے وہ خلیج پٹتی رہتی ہے جو عوام کے ادب اور نخوتی ادب میں حائل ہے۔

ان گیتوں پر حالات کی چھاپ نمایاں ہے۔ یہ گیت کب بنے، کیوں بنے، کہاں کہاں پھیلے اور ان کو پھیلانے والے کون تھے ان کی تحقیق سے ہمیں اُس ملک اور اُس خطے کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے۔ ہمیں مختلف النوع لوگوں کے توہمات اور ممنوعات TOTEMS AND TABOOS کا پتہ چلتا ہے۔ ہمارے معاشرتی نظام کے اسباب و علل پر روشنی پڑتی ہے اور قانون سازوں کے لئے آسانی مہیا ہو جاتی ہے کہ وہ پیدائش، شادی، موت کی شرح، رہنے سہنے کے طریقوں، کام کاج اور معاش کے وسیلوں، فرصت کے اوقات کے استعمال اور ان تمام چیزوں سے متعلقہ رسوم و روایات کو جان کر قانون بنائیں تاکہ ملک کے آئین عوام کی زندگی سے لاتعلق نہ ہوں۔ اور اس کام میں ستیارتھی نے ہماری بہت مدد کی ہے انہوں نے ہماری کلچرل ANTHRAPOLOGY جسے ہربرٹ سپینسر نے SOCIOLOGY کا نام دیا ہے کا راہ آسان کر دیا ہے۔ اس عظیم المرتبت کام کے سامنے سر جھکاتے

ہوئے مجھے مصنف کی خدمت میں صرف یہی عرض کرنا ہے کہ کاش انہوں نے زبان کی طرف زیادہ توجہ فرمائی ہوتی اور مضامین کو کسی خاص نظریئے کے تحت فراہم کیا ہوتا۔

یہ گیت امر ہیں اور لازوال۔ ان کی عظمت کے سلسلے میں مَیں جدید بنگال کے شاعر دشنو دے کی ایک نظم کا حوالہ دیتا ہوں جو اسی مجموعے سے لیا گیا ہے ......

کسی زمانے میں بنگال پر نواب علی وردی خاں حکمران تھے اور ناگپور کے راجہ رگھوجی راؤ بھونسلے کے سپاہی بار بار بنگال میں گھس آتے تھے اور بنگالیوں کی عزت اور آبرو پر حملے کرتے تھے۔ یہ لوگ برگی کے نام سے مشہور ہوئے اور ان کے حملوں کو بنگالی لوریوں میں برگی ہنگامے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ——————

چھیلے گھمالو، پاڑا جڑالو	ننھا سو گیا، گاؤں جمع ہو گیا
برگی ایلو دیشے	دیس میں برگی گھس آئے
بلبلئے دھان کھیئے چھے	بلبلوں نے سب دھان کھا لیا
کھاجنا دیبو کیشے	مالیہ کیسے دیں گے ؟ ......

اور اس نظم کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے دشنو دے لکھتے ہیں ——————

کتنی ہی بار لٹیرے آئے، کتنی بار
ٹھگی ہی ٹھگی میں کتنے گاؤں اجاڑ دیئے
کتنی ہی بلبلوں نے کتنے ہی دھان کے کھیت کھا ڈالے
کتنی ہی ماؤں نے لوگی گیت گایا
پھر بھی امر ہیں قائم رہے،
اس جنتا کے ——————

راجندر سنگھ بیدی
۱۴ راگست ۱۹۴۶ء

گائے جا ہندوستان!

ویری ناگ کے نیلگوں پانی میں تھکن سے چُور پاؤں ڈالے مَیں سوچ رہا تھا کہ مَیں نے اپنی عُمر کا بہترین حِصّہ ناحق خانہ بدوشی میں گزار دیا۔ ایک طرف ذاتی پریشانیاں اور دوسری طرف لہولہان دُنیا کی لہولہان خبریں اَور پھر یہ خیال کہ دیس میں ایک بھیانک قحط آنے والا ہے، پچاس سے اُوپر زبانوں کے ڈھائی تین لاکھ لوک گیت، جو میری خانہ بدوشی کے ضامن ہیں مجھے جھوٹی تسلّیاں دینے سے قاصر تھے، اُوپر شیش ناگ کی طرح پھن پھیلائے دیو ہیکل پہاڑ، نیچے مچھلیوں کی سبک خرامیوں اور مغلئی فنِ تعمیر کے آخری نشانات پر نازاں ویری ناگ، ایک بار پھر یہ خیال آیا کہ مَیں فن کی تخلیق کے لئے پیدا ہُوا ہوں اور یقیناً قدیم روایتوں کے اشوک کی طرح، جو اپنے تنے پر کسی گوری کے نازک پیروں کا لمس محسوس کرتے ہی کھِل اُٹھتا تھا، جنتا کی شاعری اور قدرت کی سحر طرازیوں نے مجھے فن کار بنا دیا ہے۔ لیکن قدرت میری حاسد بن گئی ہے۔ مجھے اُن لوگوں پر غصّہ آ

لیا تھا جو یہ سمجھنے تھے کہ ہر چشمہ پر کسی نہ کسی ناگ کا حکم چلتا ہے یہاں تک کہ اُس کے غصّے سے چشمہ ہمیشہ کے لئے خشک ہو سکتا ہے اور جو اندھی عقیدت سے مجبور ہو کر ناگ اور چشمہ کو ہم معنی الفاظ سمجھنے لگ گئے تھے۔ یہ لوگ سانپوں کی پُوجا کر سکتے ہیں، ایک فنکار کی نہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ ہر سال ویری ناگ پر جہلم کا جنم دن منایا جاتا ہے — بھادوں کے اُجالے پاکھ کی تیرھویں کے روز، جب اس نیلگوں پانی میں نہانا ثواب سمجھا جاتا ہے' یہ لوگ چشموں کی پُوجا کر سکتے ہیں ایک فن کار کی نہیں...... مجھے اُس گوری پر بھی غصّہ آنے لگا جو ہر روز آدھی رات کو، جب بیلا کے پھُول کھل جاتے ہیں، اپنا گجرا بنا لیتی تھی اور جو اب تک یہ فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ اسے کس کے گلے میں پہنائے — "بیلا پھُولے آدھی رات، گجرا میں کس کے گلے ڈالوں؟"... مجھے اس گوری پر بھی غصّہ آنے لگا جسے ظالم والدین نے ایک جاہل کے گلے باندھ دیا تھا اور جس میں اب اتنی ہمت نہ تھی کہ اپنے لئے کوئی نئی راہ ڈھونڈ نکالے — "رتن کٹوری گھی جلے، چُولھے جلے کسار۔ گھونگھٹ میں گوری جلے، جس کے مُورکھ بھرتار!" اور پھر پُورب اور ہریانے سے ہٹ کر میرے ذہن کی سُوئی چھوٹا ناگپور کی طرف گھوم گئی جہاں قدیم النسل اُراؤں دوشیزہ اپنے سپنوں کے دُولھے سے التجا کر رہی تھی — "کوٹبے ڈنڈن پاڑا کو پاڑو، پچ بالرائے راگے برنر۔ بیری بیرڑی پاڑا کو پاڑو، پچ بالرائے راگے برنر!" — ارے او گیت گانے والے کوئی بھلا سا نغمہ چھیڑ دے رے' مرے ہونٹوں کی آتمائیں سُننے آتی ہیں۔ کوئی اُشا کا نغمہ چھیڑ دے ارے گیت گانے والے، مرے ہونٹوں کی تمنّائیں سُننے آتی ہیں......

مَیں سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی حقیقت یہی ہے — "بیلا پھُولے آدھی رات"

..... "گھونگھٹ میں گوری جلے"..... یا وہ اُشا کا نغمہ جیسے مُردوں کی آتمائیں سُننے آتی ہیں۔ شاعر بولا! "ٹھیک تو ہے۔ پہلے نغمہ پھر کچھ اور"۔ پھر طنز نگار کی آواز آئی؛ "اصل حقیقت تو زندگی کے مسائل ہیں جن سے ڈر کر تم اتنی دُور نکل آئے ہو" اور پھر دُور کہیں سے بُلبل کا نغمہ گونج اُٹھا، جیسے وُہ کہہ رہی ہو — "زندگی کے مسائل تو کبھی ختم نہیں ہوتے باورے، تو کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ تم میرے نغمہ میں پناہ لو؟"

سائے بڑھ رہے تھے۔ سُورج کی آخری کرنیں بھی غائب ہو گئیں۔ آزاد، کھنڈری نٹ کھٹ ہوا بھی سُست ہو گئی۔ اب پانی میں پاؤں ڈال رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ میرے دھن کے پاتال بھیل ناچ رہے تھے۔ ٹپ ٹپ ہٹم ہٹم ہٹم۔ ایک ایک بھیل کے بعد ایک ایک بھیلنی، دائیں ہاتھ سے دائیں ساتھی کا بازو تھامے اور بائیں ہاتھ سے بائیں ساتھی کا۔ رنگ بھُومی کے مرکز میں چوکھا دِیا روشن تھا۔ شاعر کہہ رہا تھا۔ "یہ لوگ حقیقی فنکار ہیں۔ انہیں مُلک گیری کی پروا ہے نہ تحریکِ آزادی کی فکر۔ ڈھولک کہتی ہے۔ یہ سب میرے تال کا تماشہ ہے، یہی حقیقت ہے۔ پازیبیں کہتی ہیں۔ یہ سب ہماری جھنکار کا تماشہ ہے، یہی حقیقت ہے۔ بھیل دُلہن کا نیم کا گیت کتنا معنی خیز ہے — کڑوا نیمبڑا نُوں ایک ڈال میٹھول رے! مارو دھنی رنگیلو!۔ کڑوی نیم کی ایک شاخ میٹھی ہے رے! میرا دھنی رنگیلا ہے — چند آنوں کے عوض دِن بھر بیٹی کھودتے کھودتے اِن کے بیلچوں کے مُنہ ٹیڑھے ہو گئے۔ لیکن اس وقت وہ کڑوی نیم کی میٹھی شاخ کے نیچے اپنا آزاد ناچ ناچ رہے ہیں۔ نغمہ و رقص کے زیر و بم اُن کے لئے کافی ہیں؛" پھر طنز نگار کی آواز آئی: "بھیلوں کا ناچ محض مزار ہے۔ اُن کا تمدّن اُن کے لئے افیون بن گیا ہے جو حقیقت میں زہر ہے لیکن نشیلا بھی ہے"۔ شاعر

بولا "تم غلط کہتے ہو۔ زندگی کے پیڑ کی میٹھی شاخ کے پیچھے فن کاروں کا فن قائم رہ سکتا ہے۔ یہ لوگ یقیناً اُن عامیوں پر خندہ زن ہونے کا حق رکھتے ہیں جو قانون بناتے ہیں دفتر میں نوکری کرتے ہیں اور ناچ گھر میں دیر ہو جائے تو صبح کو اسپرین کی گولیاں کھائے بغیر سر درد سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔"

دُودھیا سفید چاندنی کھل گئی تھی۔ فضا میں خوشبوئیں بسی ہوئی تھیں ——
خوشبوئیں اور سرگوشیاں، آنکھیں میچ کر میں نے نیم وا پلکوں میں سے ویری ناگ کی طرف دیکھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ چناب ہے اور کوئی سوہنی کچے گھڑے پر تیر رہی ہے۔ شاعر بولا "سوہنی اب بھی زندہ ہے —— سوہنی آپ ڈُبّی جند تردی اوچ جھناں دے! —— سوہنی خود ڈوب گئی ہے پر اُس کی رُوح برابر چناب کے پانیوں پر تیر رہی ہے۔" طنز نگار کہہ رہا تھا: "یہ پنجابی لوک گیت فضول ہے۔ کچے گھڑے پر تیرنے والی سوہنی بے وقوف تھی۔"

میری حالت اُس پجاری کی سی تھی جو اپنے من مندر میں ان گنت بُت رکھتا چلا گیا ہو۔ اب اس مندر میں بھیل چھوکریاں ناچ رہی تھیں —— دیوداسیوں کی طرح:

"آنکھیانی کاجل رلی رلی جائے،
کا پڑی نا پھُوندا نی نمی جائے،
رنیسائی نہ جا تو، رے سوریو، گھومسی رے لول،
آؤ و آؤ و رے سوریو، گھومسی رے لول!
—— آنکھ کا کاجل پھیل رہا ہے،
انگیئے کا پھُندنا جھک رہا ہے،

ڈوبھ کر نہ چلی جائیو ری چھوکریو، ہم گھوم گھوم کرناچیں گی
آؤ آؤ اری چھوکریو، ہم گھوم گھوم کرناچیں گی ۔

شاعر بولا "آنکھوں میں کاجل کی لکیریں پھیل جانے سے پیشتر ہی تو جھوم کا مزا ہے ۔ وہ پورب کا نغمہ بھی تو سُنا ہوگا ۔۔ کبھی آپ ہنسے کبھی نین ہنسیں، کبھی نین کے بیچ ہنسے کجرا ۔" پھر طنز نگار کی آواز آئی : "ہنستے ہوئے کاجل کی عمر کے گھڑی کی ہوگی ؟" طنز نگار کہہ رہا تھا : "کاجل میں کیا دھرا ہے ؟ گانا ہی ہو تو مزدوروں اور کسانوں کا بین الاقوامی گیت گاؤ ۔۔ اے دُنیا کے مظلوم انسانو! اُٹھو، اُٹھو! اے بھُوکے محنت کشو ۔ انصاف کا جوالا مکھی اُبل رہا ہے ۔ اپنے ماضی کو بھلا دو ۔ ساری دُنیا کے غلامو، ایک ساتھ مِل کر اُٹھو ۔ دُنیا بھی کروٹ لے رہی ہے ۔ اب تک ہم کچھ بھی نہیں تھے، اب ہم ہی سب کچھ ہوں گے ۔ یہ ہماری آخری جنگ ہے ۔ آؤ ہم تم ایک ہو جائیں ۔ دُنیا کی تمام قومیں ایک ہو جائیں گی ۔"

چاندنی رات کی ہر سلوٹ کہتی تھی، چاند ہے تو ستارے ہیں، یہی حقیقت ہے، ستارے کہتے تھے، ہم شاعر پر بھی اُسی طرح چمکتے ہیں جیسے طنز نگار پر ۔ ۔ ۔ ۔ جنگ شدید سے شدید تر ہوتی جاتی تھی ۔ بم باری ۔ آگ ہی آگ، بھُوک اور موت ۔ زہریلی گیسیں ۔ زخمیوں سے بھرے ہوئے ہسپتال ۔ کون جانے یہ جنگ کب ختم ہو ۔ میں نے سوچا، جنگ سے پہلے اس دیس میں ایک بھیانک قحط آنے والا ہے ۔ اُس وقت مجھے اُس اہیر کا دھیان آیا جس کا عشق بھُوک کے مارے ختم ہو رہا تھا ۔۔ "بھکیا کے مارے برہا بسر گا، بھُول گئی کجری کبیرا، دیکھی کے گوری کے موہنی مُورتی، اب اُٹھے نہ کریجوا ماں پیر ۔" ۔۔ بھُوک کے مارے برہا بسر گیا، کجری اور کبیر گیت بھی بھُول

گئے۔ گوری کی موہنی صورت دیکھ کر اب میرے کلیجے میں پیڑ نہیں ہوتی۔

اپنی اقتصادی حالت پر غور کرتے کرتے ایک بار پھر اپنے ماضی پر جھنجھلاہٹ سی ہوئی۔ ناحق میں لوک گیتوں کی تلاش میں بھٹکتا رہا، ناحق گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے ہی کو آدرش بنائے عمر برباد کرتا رہا۔ پھر میں نے یہ کہہ کر دل و دماغ کو تسلی دی کہ عالمگیر مصیبتوں کے پیشِ نظر میری تکلیفوں کی کیا اہمیت ہے۔ شاعر بولا: "جہاں گردی سے بڑی کوئی تعلیم نہیں، فن کی پختگی کے لئے اس سے بڑا کوئی معاون نہیں۔"

جگنو اپنی آنکھ مچولیوں میں مگن تھے۔ پاس ہی ایک مغلئی جھروکے میں دیا روشن تھا۔ ویری ناگ کی چاندنی رات ایک نازک بدن حسینہ کی طرح نرم گہرے سانس لے رہی تھی۔ اُس وقت میرے ذہن کی سوئی بہار کے ترہت ضلع کی طرف گھوم گئی اور ایک کسان کی آواز آنے لگی:

"ہے بھولا بابا کیہن کئے لون دین
کھیتی پتھاری، بھولا سے ہو لیلا چھین
بھائی سہودر، سے ہو گیل بھین
گھر میں نہ کھرچی، باہر نہ ملے رین
گاؤں کے مالک، نہ پڑے دئی رہے نین
ایکے گو لوٹا چھلی، بھائی بھیلئی تین
پنیا پو پیت کال، ہوئی آچھنا چھین
ایکے گو بیل بیچ گیل، مہاجن لیلک رین
کر کٹمب سب، بھیلئی پرہین!"

— ہے شو بابا! تم نے میرے دل کتنے دُکھ بھرے بنا ڈالے
تھوڑی بہت کھیتی تھی، وُہ بھی تم نے چھین لی
سگے بھائی تھے، وہ الگ ہو گئے
گھر میں خرچ نہیں، باہر قرض نہیں ملتا
گاؤں کا زمیندار رات کو سونے نہیں دیتا
ایک لوٹا ہے اور ہم تین بھائی ہیں
پانی پیتے وقت چھینا جھپٹی ہونے لگتی ہے
ایک بیل بچ گیا تھا، اُسے مہاجن نے قرض کے بدلے لے لیا۔
کٹمب والے سب پرائے ہو گئے!

شاعر بولا: "یہ تو وہی 'دو اور دو' — چار روٹیاں!' والی شاعری ہے۔ کوئی نازک خیالی نہ ہو تو شاعری بیکار ہے۔" طنز نگار کہہ رہا تھا: "مجھے تو یہ گلہ ہے کہ یہ لوگ قسمت کے غلام ہیں۔ اقتصادیات کی باتوں میں بھی خدا کو لے بیٹھتے ہیں، اپنی غریبی کو دیوتاؤں سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب اس قدر جہالت ہے، یہاں انقلاب کیسے آسکتا ہے؟"

پھر کہیں سے بندیلکھنڈ کی ایک پھاگ گونج اُٹھی:
"گوانہوں ہتے سو ہو گئے
بھُس لے گئی اندوار
لوٹے میں ٹلوا گئے
باڑھی ہیں کھگبار —

جری بانے میں لکھ لو دونی جوبنا!"

--- گیہوں تھا وہ ختم ہو گیا

بھوسے کو جھکّڑ اُڑا لے گیا

گھاٹے میں بیل بک گئے

بنیئے کا اناج لوٹانے میں میری ہنسلی چلی گئی

جرمانے میں میری دونوں چھاتیاں لکھ کر لے جاؤ!

طنز نگار نے شاعر سے پوچھا۔" اس لازوال تلخی اور طنز کے آگے بولنے کی جرأت ہے تم ہیں، یہ دبی ہوئی ایسی ہوئی جنتا نہ جانے کب تک اپنی چھاتیاں پیٹ پیٹ کرتی رہے گی!"

شاعر چُپ تھا۔

یہ خواب تو نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا وری ناگ کے مغلئی کھنڈرات کے اُس پار --- اُن اندھے، بہرے، گونگے کھنڈرات کے اُس پار، بنگال بسا ہوا تھا۔ کوئی دوشیزہ اپنے محبوب کو بلا رہی تھی:

"بشیتھے جائیو بھولو بنے، ہے بھرمرا!

بشیتھے جائیو بھولو بنے۔

بالائے چندیر و باتی

جگیے ردوو شارا راتی گو

کوئیبو کتھا ششیر روشنے اہے بھرمرا!

بشیتھے جائیو بھولو بنے

جودی وا گھمائے پوڑی
شپنیر دیتھ دھوری گو
نیر لو چرنے جائیو ہے بھرمرا!
نشیتھے جائیو پھولو بنے
تو مار گان جینو بھانگے نا
آمار گھوم جینیو بھانگے نا
پھولیر گھوم جینو بھانگے نا
ڈالیر گھوم جینو بھانگے نا
نشیتھے جائیو پھولو بنے" ہے بھرمرا!
نشیتھے جائیو پھولو بنے رے"

— آدھی رات کو پھولوں کے جنگل میں درشن دیجیو رے بھونرے!
آدھی رات کو پھولوں کے جنگل میں درشن دیجیو۔
چاند کا دیا جلا کر رے
رات بھر میں جاگتی رہوں گی رے
اوس کی بوندوں سے باتیں کئے جاؤں گی، رے بھونرے!
"آدھی رات کو پھولوں کے جنگل میں، درشن دیجیو
اگر میں سو بھی جاؤں
سپنوں کے راستے پر چل پڑوں گی رے
چپ چاپ قدموں کے ساتھ درشن دے جیو

تمہارا گیت تھمنے نہ پائے

میری نیند ٹوٹنے نہ پائے

پھولوں کی نیند ٹوٹنے نہ پائے

ڈالیوں کی نیند ٹوٹنے نہ پائے

آدھی رات کو پھولوں کے جنگل میں درشن دیجیو رے بھونرے!

آدھی رات کو پھولوں کے جنگل میں درشن دیجیو۔

شاعر کہہ رہا تھا "بھونرے کا گیت تھمے گا نہیں اور پھولوں کے جنگل کی نیند بھی نہیں ٹوٹے گی۔" طنز نگار بولا "میاں نکلو اس بھول بھلیاں سے۔ زندگی کی بے پناہ تلخیوں سے یوں چھٹکارا نہیں ملنے کا۔ وہاں زمین سنگلاخ ہے نا! اور یہاں خمار آلود خواب میں پگڈنڈیوں پر ریشم بچھ جاتا ہے۔" شاعر کہہ اٹھا "خدا کی قسم بیتھوون اسے سن پاتا تو عش عش کر اٹھتا۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ بیتھوون کو اپنی مشہور سمفنی کی بنیادی لے ایک لوک گیت سے حاصل ہوئی تھی۔" . . . . لیکن میں نے طنز نگار کی بات پسند کی، حقیقت پسندی کی سنگلاخ زمین مجھے بلا رہی تھی۔ شاعر نے گرم ہو کر کہا: "مجھے چھوڑ کر تم کہیں نہ جا سکو گے۔ اپنا وعدہ یاد کرو۔" طنز نگار بھی جھنجھلایا "میں جانتا ہوں تم اس عادی قیدی کی طرح ہو جسے لاکھ کوئی جیل سے آزاد کرے مگر اس کے قدم گھوم پھر کر اسی جیل کے دروازے پر پہنچ جاتے ہیں۔"

چاروں طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ سایوں کی اپنی حیثیت تھی —— کوئل کے انڈوں پر بھورے بھورے دھبوں کی طرح۔ معلوم ہوتا تھا رات لمبی ہوتی چلی جائے گی —— شہزادی کی سو سالہ نیند کی طرح۔ شاعر کہہ رہا تھا: "بلبل کا نغمہ

مجھے اُتنا ہی پیارا ہے جتنا ارنسٹ ٹالر کو وہ گھونسلا پیارا تھا جسے ایک ابابیل نے اُس جیل کی کوٹھڑی میں بنایا تھا جہاں ٹالر پانچ برس تک قید رہا، اور جس کی تصویر اُس نے اپنی ایک مشہور نظم میں پیش کی ہے۔" طنز نگار بولا: "تم نے صرف ٹالر کا نام سُن رکھا ہے۔ تم اُس افیمی کی طرح ہو جسے نشہ چاہئے، چاہے وُہ زہر ہی کیوں نہ ہو۔ تم نے سمجھا ٹالر کی ابابیل والی نظم بھی افیم کی گولی ہو گی جسے تم ہتھیلی پر مل کر مُنہ میں ڈال لوگے اور ایک گھونٹ پانی کے ساتھ اسے نگل جاؤ گے۔ پھر ٹالر کا نام نہ لینا۔ ایک افیمی کیا جانے ٹالر کی قدر؟ ٹالر نے انقلاب کو زندہ زبان دی۔"

پھر راجپوتانہ کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ کوئی گوری اپنے گھُڑسوار محبوب سے رُکنے کی التجا کر رہی تھی:

" ناگ جی، گھوڑی دوئے گھڑلا تھام رے
ویری گھونگھٹ ری چھیّاں کروں، ناگ جی!
ناگ جی، تاوڑیو پانی پڑے، ہاں رے
ویری، گھائل کردی تاوڑے، او ناگ جی!
ناگ جی، من لوبھی من لالچی رے
ویری، من چنچل من چور، او ناگ جی!
ناگ جی، من رے مٹے! نہ چلئے رے
ویری پلک پلک من اور، او ناگ جی!
ناگ جی، تڑک تڑک مت توڑ رے
ویری کنواری رے تار جیوں، ناگ جی!

ناگ جی، جیوں ٹوٹے تیوں جوڑ رے
وَیری، پریت پُرانی نہ پڑے، ناگ جی!
ناگ جی، کھایو کھجانے رو مال رے
وَیری، لُون حرامی ہو گیئو، ناگ جی!
ناگ جی، ایک بر گھُڑلو موڑ رے
وَیری، من رے ری واتاں مَیں کہوں، ناگ جی!
— ناگ جی! دو گھڑی کے لئے گھوڑا تھام لو رے
ارے بَیری! آؤ تم پر گھونگھٹ کی چھاؤں کر دُوں، ناگ جی!
ناگ جی! بھیانک دُھوپ پڑ رہی ہے، ارے ہاں،
ارے بَیری! دُھوپ نے مجھے گھائل کر دیا، ناگ جی!
ناگ جی! من لوبھی ہے، من لالچی ہے رے
ارے بَیری! من چنچل ہے، من چور ہے، ناگ جی!
ناگ جی! من کے پیچھے مت چلو رے
ارے بیری! پلک جھپکاتے ہی مَن اَور کا اَور ہو جاتا ہے، ناگ جی!
ناگ جی! پریت کو یوں اچانک مت توڑ ڈالو رے
ارے بَیری! جیسے چرخہ کاتنے والی سُوت کا تار توڑ ڈالتی ہے، ناگ جی!
ناگ جی! ٹوٹنے کے فوراً بعد اسے جوڑ دو رے
ارے بیری! پریت تو کبھی پُرانی نہیں ہو پاتی، ناگ جی!
ناگ جی! تم نے خزانے کا مال خوب کھایا ہے رے

ارے بَیری! تم نمک حرام ہوئے جاتے ہو، ناگ جی!
ناگ جی! ایک بار گھوڑا موڑ گورے
ارے بَیری! میں من کی باتیں کروں گی، ناگ جی!

شاعر بولا: "مجھے اس گیت کا وہ حصّہ سب سے زیادہ پسند ہے جہاں چرخہ کاتنے والی کے ہاتھ میں سُوت کا تار ٹوٹنے اور جوڑنے سے عشق کو تشبیہ دی گئی ہے۔ میں نے خود مارواڑنوں کی زبان سے بارہا یہ گیت سُنا ہے۔" طنز نگار کہہ اُٹھا "اور سب سچ، لیکن مارواڑیوں کے گانے کی بات جھوٹ۔"

خیال آیا کہ اُٹھ کر ڈیرے کو چل دُوں، شاعر اور طنز نگار دونوں سے چھٹی پا کر آرام سے سو جاؤں۔ لیکن اسے چاندنی رات کی سحر طرازی سمجھئے کہ میں وہاں جم کر بیٹھا رہا۔ ہلکی ہلکی گدگدی کی طرح اندور کا وہ لوک گیت میرے دِل و دماغ کو سہلانے لگا جس میں ایک گوری اپنے بالم سے کہتی ہے۔ 'تم چل دو گے تو میں کھچڑی پکاؤنگی، رہ جاؤ تو کھیر پکاؤں گی۔ بالم کہتا ہے، تمہاری کھچڑی چکھ لوں گا اور تمہاری کھیر کھاؤں گا' پر مجھے جانا ہے ضرور، گوری کہتی ہے، 'تم چل دو گے تو سپید ساری پہنوں گی، رہ جاؤ تو دلھن کی ساری پہنوں گی۔ بالم جواب دیتا ہے، تمہاری سپید ساری کو دیکھ لوں گا، تمہاری دلھن کی ساری کا رس لے لوں گا، پر مجھے جانا ہے ضرور' گوری کہتی ہے' تم چل دو گے تو کمبل بچھاؤں گی، رہ جاؤ تو پھولوں کی سیج بچھاؤں گی' بالم جواب دیتا ہے، تمہارے کمبل پر بیٹھ کر دیکھ لوں گا، تمہاری پھولوں کی سیج کا رس لے لوں گا، پر مجھے جانا ہے ضرور۔

شاعر کہہ رہا تھا: "محبت کبھی مرتی نہیں۔" طنز نگار بولا "جس سے آدمی جتنی محبت

کرتا ہے اُس سے اُتنی ہی نفرت بھی کرتا ہے۔ مَیں کہتا ہوں محبت سے کہیں زیادہ نفرت ہی کام کر رہی ہوتی ہے۔"

سونی گھمانی جا چکی تھی۔ اب پنجاب سے آواز آ رہی تھی:-

"بارے	اِک واری مر گوریئے، مینوں ریجھ رنڈیاں دی آوے
جھاماں	پیکے جا کے مر گوریئے، چھٹی لے کے مکانیں آواں
کھالسا	پیکے جا کے مر جاواں گی، میری مڑھی تے نہ آویں بھلیا مانسا!
تیلی	ماپیاں دی دھی مر گئی، اُڑھ گئی چنن دی گیلی
ہوری	سوہریاں دی نونہہ مر گئی، اُڑھ گئی دماں دی بوری
بوتا	اِک واری بول گوریئے، تیری مڑھی تے آن کھلوتا
چھولے	مڑھیاں چوں اُڈ طوطیا کدی موئے مُردے نئیں بولے
مایا	اِک واری جیوں گوریئے، رنڈا ہو کے بڑا دکھ پایا
ـــــ ترجمہ کاٹ کے پانے"	ایک بار مر جاؤ گوری، مجھے رنڈوں پر رشک آتا ہے۔
جھانواں،	میکے میں جا کے مر جاؤ گوری، چھٹی لے کر ماتم پرسی کو آؤں گا۔
خالصہ،	میکے میں جا کر مر جاؤں گی، میری سمادھ پر مت آنا بھلے آدمی!
تیلی،	ماں باپ کی بیٹی مر گئی، چندن کی شہتیری بہہ گئی۔
ہولی،	ساس سسر کی بہو مر گئی، روپیوں کی بوری بہہ گئی
جوان اُوٹ	ایک بار تو بولو گوری، مَیں تمہاری سمادھ پر کھڑا ہوں۔
چنے	سمادھوں میں سے اُڑ جا رے طوطے، مرے ہوئے لوگ کبھی نہیں بولتے۔
مایا	ایک بار تو بولو گوری، رنڈوا ہو کر مَیں نے بڑا دکھ اُٹھایا ہے۔

طنز نگار بولا! "گوری نے ضرور خودکشی کی ہو گی۔ خالصہ بھی عجیب آدمی ہے، یقیناً وہ ذہنی خلا میں مُبتلا ہے۔ وہ محبت کر سکتا ہے نہ نفرت۔"

اُس وقت ایک اور پنجابی لوک گیت گُونج اُٹھا۔ شاعر اور طنز نگار دونوں ہمہ تن گوش ہو کر اُسے سُننے لگے:۔

"پُوڑے نُوں جی کرے تے آٹا گھولیا
آٹا گھولیا، جے پہلا پُوڑا پایا گوانڈھن پُچھدی
گوانڈھن پُچھدی، جے دُوجا پُوڑا پایا تاں سسّ جھاکدی
سسّو جھاکدی، جے گوڈے ہیٹھ لکوماں تاں گوڈا سڑ گیا
گوڈا سڑ گیا، جے پیڑھی ہیٹھ لکوماں تاں پیڑھی سسّ دی
پیڑھی سسّ دی، جے منجے ہیٹھ لکوماں تاں منجا جیٹھ دا
منجا جیٹھ دا، جے کوٹھی ہیٹھ لکوماں تاں چُوہے جھاکدے
چُوہے جھاکدے، جے پوڑھی لے کے چڑھی تے ٹُٹا مُڑ گیا
ٹُٹا مُڑ گیا، جے کوٹھے لے کے چڑھی تاں اِلّاں بھوندیاں
اِلّاں بھوندیاں، جے لے چُبارے وڑی تاں ماہی آ گیا
ماہی آ گیا، ہتھ وِچ اِٹّاں چمکاں تے سانُوں ماردا
سانُوں ماردا، سسّو دے من وِچ چاء کہ نُونہہ نُوں کُٹیا
نُونہہ نوں کُٹیا، مر جاؤ پرائی دھی جائیں گا پٹیا!"

—— پُوڑا کھانے کو جی چاہتا ہے اور مَیں نے آٹا گھول لیا۔ آٹا گھول لیا۔ پہلا پُوڑا توے پر ڈالتی ہوں تو پڑوسن پُوچھ تاچھ کرتی ہے۔

پڑوسن پوچھ تاچھ کرتی ہے، دُوسرا لوڑا توے پر ڈالتی ہوں تو ساس تاکنے لگتی ہے
ساس تاکنے لگتی ہے، اسے گھٹنے تلے چھپاتی ہوں تو گھٹنا جل گیا۔
گھٹنا جل گیا، پیڑھی کے نیچے چھپاتی ہوں تو پیڑھی ساس کی ہے۔
پیڑھی ساس کی ہے، کھاٹ کے نیچے چھپاتی ہوں تو کھاٹ جیٹھ کی ہے۔
کھاٹ جیٹھ کی ہے، بکھاری کے نیچے چھپاتی ہوں تو چُوہے دیکھتے ہیں۔
چُوہے دیکھتے ہیں، اسے لئے ہوئے میں زینے پر چڑھ گئی تو ڈنڈا تڑک گیا
ڈنڈا تڑک گیا، میں چھت پر چڑھ گئی تو چیلیں منڈلاتی ہیں
چیلیں منڈلاتی ہیں، میں چوبارے میں چلی گئی تو شوہر آگیا
شوہر آگیا، اُس کے ہاتھ میں تازی لچکیلی چھڑیاں ہیں اور وہ مجھے پیٹتا ہے۔
مجھے پیٹتا ہے، ساس کے من میں چاؤ ہے کہ بہو کو پیٹ ڈالا
بہو کو پیٹ ڈالا، ارے پرائی بیٹی مر جائے گی اور تو برباد ہو جائے گا۔

طنز نگار بولا: "میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آدمی جس سے جتنی محبت کرتا ہے اُس سے اُتنی ہی نفرت بھی کرتا تھا، بلکہ محبت سے کہیں زیادہ نفرت ہی کام کر رہی ہوتی ہے۔"

شاعر بولا۔ "تمہاری بات پر میں غور کر رہا ہوں۔"

طنز نگار بولا۔ "عورت بھی عجب بلا ہے۔ اَن گنت صدیوں سے وہ مرد کے ہاتھوں پٹتی رہی ہے، پھر بھی وہ اُسے محبت کئے جاتی ہے۔"

شاعر چپ تھا۔ اُس کی حالت اُس مداری کی سی تھی جسے ہمیشہ کھوٹا پیسہ نصیب ہوتا ہو۔ اُس وقت کرنائک کی آواز سُنائی دینے لگی:

"سرپرا بیلے سلی سرپرا تیلی
سرپرا گدڑا چگی الی نن ننھا
بنیی نانما یاں ترّی الی!"
— سرپرا گاؤں کی قسمت جاگے، سرپرا میں بیج بوئے جائیں
سرپرا کی پہاڑی سرسبز ہو جائے اور مجھ سی
عورت کا انصاف ہو جائے۔
اب کے طنز نگار کچھ نہ بولا۔ میں نے پھر سوئی گھما دی۔ یہ تامل ناڈو کی آواز تھی:
"اِرشی اِرُدک کدّو پرُوتّی رُو کدُّو
اڈُو پُو کلّا دُوشنگرم!
کا ترُ کدُّو تُول پر کدُّو
کد وِلّا دشنگرم!
پونڈاتی وندُو مُتّے بزکرال
پرُوتی اِلّا دشنگرم!
داشان وندُو واش ہل بزکران
کا شِلّا دشنگرم!"
— چاول ہے، دال ہے
چولھا نہیں، یہی دِقّت ہے۔
ہوا چل رہی ہے، گرد اُڑتی ہے
کواڑ نہیں، یہی دِقّت ہے۔

بیوی آ کر سامنے کھڑی ہے

ساڑی نہیں، یہی دِقّت ہے۔

فقیر آ کر دروازے پر کھڑا ہے

ادھیلا نہیں، یہی دِقّت ہے۔

شاعر کی حالت اُس گلہری کی سی تھی جو جنگل سے اخروٹ اُٹھا اُٹھا کر اپنے مُونٹھے میں جمع کرتی جائے۔ اُسے خوش کرنے کے لئے میں نے گجرات کی آواز حائل کی:

"کائی مُدھر مُدھر رنکارتی امے گھنٹڑیو

امے کریئے منگل ناد، مُدھری گھنٹڑیو

امے پوڑھیا دیو جگاڑیئے، ہو گھنٹڑیو۔۔۔۔"

کوئی مُدھر جھنکار کرتی ہوئی ہم ہیں گھنٹیاں

ہم منگل گان کرتی ہیں، مدھر گھنٹیاں!

ہم سوتے دیوتا کو جگاتی ہیں ـــــ گھنٹیاں!

طنز نگار بولا: "اب بند بھی کرو یہ گھنٹیاں۔ یہ صرف دیوتاؤں کو جگا سکتی ہیں۔ بھوکے انسانوں کی قسمت کو جگانا ان کے بس کی بات نہیں۔ کسی کی بیوی کو خودکشی سے روکنے کی طاقت ان میں کہاں؛ نہ یہ سُرپرا گاؤں کی عورت کا انصاف کر سکتی ہیں، نہ تاپل ناڈ کی دِقّتوں کو دُور کر سکتی ہیں۔"

بُلبل کا نغمہ شاید ہمارے سوگیتوں پر بھاری تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میری رُوح سے صدیوں کا بوجھ اُتر گیا۔ لیکن شاعر بولا: "ویری ناگ گویا ایک بھوری بھینس ہے ـــــ جُگالی کرتی ہوئی بھوری بھینس ـــــ اے میری بھوری بھینس، اے میری بھوک کی کیا فکر؟" اُس کا

دھیان بدلنے کے لئے میں نے خود سُوئی گھُما دی۔ اُڑیسہ کی قدیم النسل سورا قوم اپنا اجتماعی نغمہ چھیڑ رہی تھی:

" اے ایر پُتلا، لیم سی تم
اے ایر پُتلا، لیم جینگ تم
سرجی آنیپ بن سین تائی
آمان اُمتے باتے سر بجالم
رٹڑ دلے ڈی، تاٹ ڈاکُو امتے
اب گارلیں ڈکُو امتے!"

—— ارے ہل، تیرے ہاتھوں کو نمسکار
ارے ہل، تیرے پیروں کو نمسکار
سال کے پیڑ کو سراہتا ہوں
جس سے تم بنائے گئے ہو
تم سدا بلوان رہو
تم سدا کام کے لئے تیار رہو

نہ جانے کتنی صدیوں سے یہ گیت گایا جا رہا تھا —— یہ گیت جس میں سُورا جنتا نے اپنی رُوح تک سمو دی تھی۔ اُس وقت مجھے دو لڑکیوں کا دھیان آیا۔ ایک نے گیت لکھانے سے تنگ آ کر کہا تھا: "تم گیت پر گیت پوچھے جا رہے ہو، یہ کیوں نہیں پوچھتے، گیہوں کا کیا بھاؤ ہو گیا؟" دُوسری نے پتھر کُوٹتے کُوٹتے کہا تھا: "میرا نام ہے روٹی کھاؤ پانی پیو!" شاعر اپنا نام "نہ پھل نہ روٹی" بتاتا یا شاید

طنز نگار کے پیشِ نظر اُسے "گیت ہی گیت" کا لقب دیا جا سکتا تھا۔

ٹمٹماتے دیئے کی طرف دیکھتے ہوئے طنز نگار بولا: "تیل کے بغیر تو دیا بھی نہیں جلتا۔ کھانا کھائے بغیر شاعر نہ جانے کیسے گیتوں میں مگن رہ سکتا ہے"......

مَیں نے ایک شرابی کی طرح کہا ــــ "لو ایک گھونٹ اَور سہی" اور میں نے اب کے گُلمرگ کی طرف سُوئی گھُما دی:

"گُور گُور کر لو کن کے دَورو، کن کے دُورو
دلہ ہند شاہزاد، آکھ لاہُورو آکھ لاہُورو
نال چھ کھال، مل ہٹہ ہنزُورو، ہٹہ ہنزُورو
ٹنڈ مار دَیو، مرگے سُورو، مرگے سُورو
لٹہ لٹہ نیمو، ہتہ منصُورو، ہتہ منصُورو
آنگن مُوپک، وانگن ژُورو، وانگن ژُورو
سُون کیاریو، کھُولہ زنبُورو، کھُولہ زنبُورو
ژ رہا پرونا، چھُو نہ دستورو، چھُو نہ دستُورو"

ــــ اپنے آغوش میں تجھے جھلاؤں گی، میرے کان کے آویزے، ہیرے کے ان آویزو!
تم دلّی کے شہزادے ہو، تم لاہور سے آئے ہو، لاہور سے آئے ہو
تمہارے گلے میں بادام کی گریوں کا ہار ہے، تم چلتے ہو تو آواز آتی ہے، چلتے ہو تو آواز آتی ہے۔
بیسوں کی انگلیوں کے سرے تو نہیں جل گئے، ارے مر کر راکھ ہونے والے
مر کر راکھ ہونے والے!

بار بار میرے ہاں آؤ، ارے پاگل منصور، پاگل منصور!
میرے آنگن سے مت گزرو، ارے بینگن چرانے والے، بینگن چرانے والے!
تیرے لئے کیا پکاؤں؟ — انڈے کا سالن؟ انڈے کا سالن؟
نقاب تو اُلٹ دیتی، پر یہ دستور نہیں، دستور نہیں۔

بھوکا شاعر ہمہ تن گوش ہو گیا تھا۔ بولا: "بہت خوبصورت نغمہ ہے۔ ترل رل ترل رل —— جیسے کوئی چشمہ گنگنا رہا ہو۔ سچ جانو اِس سے تو کچھ ایسی خوشبو آتی ہے جو تازہ کٹے ہوئے دیودار کی خوشبو سے بھی بڑھ کر ہے۔"

میرا ذہن اچھا خاصا ریڈیو بن گیا تھا۔ ذرا سوئی گھمائی اور نغمہ بدل گیا۔ شاعر کی حالت کچھ اُس شخص کی سی تھی جو محفل میں بیٹھا ہو مگر پھر بھی اُسے یہ احساس ہو کہ اُس کے گرد تنہائی نے جال بُن رکھا ہے۔ مَیں نے پھر سوئی گھما دی۔ ریڈیو بول رہا تھا: "یہ ویری ناگ ہے۔ ابھی آپ بُلبل کا نغمہ سُن رہے تھے۔ اب ایک کشمیری لوک گیت سُنیئے، جس کے ٹیپ کے مصرعے کا مطلب ہے، کہ ویری ناگ سے دھان کے پُولے باندھ لیں . . . . . ." طنز نگار نے جھٹ سے سوئی پرے گھماتے ہوئے کہا: "ہندوستان غلام ہے۔ تاریکی ہی تاریکی ہے، جہالت ہی جہالت، بھوک ہی بھوک، لہو لہان دُنیا کی لہو لہان خبروں سے تمہاری طبیعت بہت پریشان رہتی ہے۔ اور تم نے کہا تھا نا کہ جنگ سے پہلے دیس میں بھیانک قحط آنے والا ہے۔" ہندوستان کے مسائل بھوتوں پریتوں کی طرح میرے کانوں میں چیخنے لگے۔ شاعر نے سنبھل کر کہا: "لاکھ جنگ جاری رہے، لاکھ تاریکی ہو، جہالت ہو، غلامی ہو، نغمہ ہی حقیقت ہے، رقص ہی

حقیقت ہے، رنگ ہی نغمہ ہے، نغمہ ہی رنگ ہے، گھبراؤ مت نغمہ ہی آزادی ہے، نغمہ ہی اُشا ہے . . . . .''

میرا ریڈیو بول رہا تھا: ''یہ کلکتہ ہے۔ ابھی آپ نے دیپالی خاستگیر سے رابندرا ناتھ ٹیگور کا گیت سُنا۔ اب جے شری مجومدار سے ایک بنگالی لوک گیت سُنیے:۔

''او بھائی نا ایر ماجھی، شُنو بولی دُکھیر کتھا شُن
کتو مانش گورو مرے گیلو جیشٹھی ماشیر جھڑے
او بھائی جیشٹھی ماشیر جھڑے
تال گاچھ تے سالک پاکھی ڈیمے تاؤت پڑے
او بھائی ڈیمے تاؤت پڑے
آمار بئو گیچھے باپیر باڑی مرے چھے تار پشی رے
او بھائی نا ایر ماجھی، شُنو بولی دُکھیر کتھا شُن۔''

—— ارے بھائی ناؤ کے ماجھی! سُنو میں بتاؤں میرے دُکھ کی کتھا سُنو۔
کتنے ہی آدمی اور مویشی مر گئے جیٹھ مہینے کے طوفان میں
ارے بھائی! جیٹھ مہینے کے طوفان میں
تال کے پیڑ پر سالک پنچھی انڈے سے رہا ہے
او بھائی! انڈے سے رہا ہے۔
میری بہو باپ کے گھر گئی ہے اُس کی پھوپھی مر گئی۔
ارے بھائی ناؤ کے ماجھی! سُنو میں بتاؤں میرے دُکھ کی کتھا سُنو۔

شاعر اور طنز نگار خاموش تھے۔ وسط ہند کے قدیم النسل گونڈوں کے

ڈھول بجنے لگے اور اُن کے کرما ناچ کا گیت گونج اُٹھا:

"تھاری بینچے لوٹا بینچے اور گرے کا ہار رے
اتنا میں بیچے ناہیں، جیئو گھبرائے 'مایاں!
اے منڈلا جیلا میں، کٹھن جینا ہائے رے!

—— مَیں نے تھالی بیچ دی، لوٹا بیچ دیا اور گلے کا ہار بھی
اتنے پر بھی پورا قرضہ نہیں چُکتا۔ جی گھبراتا ہے' پریتم!
اِس منڈلا ضلع میں زندگی کٹھن ہو گئی، ہائے رے!

شاعر اور طنز نگار بدستور خاموش تھے۔ میں نے کہا: "لوک گیتوں میں دیش کا صحیح حقیقی چہرہ نظر آتا ہے' یہ دیش کی اپنی آواز ہے، اپنی بپتی، ہر طرح کے تصنع سے بے نیاز۔"

شاعر بولا: "نئے دَور کے پیشِ نظر نئے گیت جنم لے رہے ہیں۔ یہ جنگ کا زمانہ ہے۔ پنجاب کے "گِدھا" ناچ میں آج کل عورتیں ایک نیا گیت گانے لگی ہیں —— 'اگے راہی راہ پچھدے، ہُن پچھدے لڑائی کتھے لگی'؛ یعنی پہلے راہی راستہ پُوچھتے تھے، اب وہ پُوچھتے ہیں، جنگ کہاں چھڑ گئی؟"

طنز نگار نے شاعر کے اِس بیان کی داد دی اور کہا: "تم ٹھیک کہتے ہو تم نے وہ پنجابی گیت بھی تو سُنا ہوگا —— 'گڈی سرکاری پُلاں توں لنگھدی چھم کر کے، پُتر ماواں دے گھِنّی ویندی آہند کر کے!' یعنی سرکاری ریل گاڑی پُلوں کے اُوپر سے گزر رہی ہے، ماؤں کے بیٹوں کو وہ بند کئے ہوئے لئے جا رہی ہے۔ یہ گیت بھی اسی جنگ کے زمانہ میں پیدا ہوا ہے جبکہ روز ریل گاڑیوں

میں ہزاروں نئے رنگروٹ اپنی اپنی چھاؤنیوں کو جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ماں آخر ماں ہے۔ اُسے تو بیٹوں کی جُدائی زہر کا گھونٹ معلوم ہوتی ہے۔ اس بیچارگی میں وہ اپنے پیر کا آسرا لیتی ہے اور اُس سے دُعا کی درخواست کرتی ہے کہ اُس کے لاڈلے بیٹے صحیح سلامت لوٹ کر گھر آئیں۔"

میں نے کہا: "لیکن نئے گیت ابھی کٹھالی میں پگھلتے سونے کی طرح ہیں۔"

ویری ناگ کی وہ رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ میرے سامنے ہندوستان کا نقشہ تھا ــــ کبھی دیو قامت کسان کے ہاتھ کی طرح۔ قسمت کی اچھی بُری لکیروں کی طرح اس پر اَن گِنت پگڈنڈیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ جو پگڈنڈی مجھے ویری ناگ تک لے آئی تھی، اب گہرے گہرے سایوں میں یوں چمک رہی تھی، جیسے یہ کسی اِترائی ہوئی البجائی ہوئی دُلہن کی مانگ ہو۔

شاعر بولا: "تمہارے پاؤں اُلجھے ہوئے راستوں کو سُلجھا چکے ہیں۔"

طنز نگار کہہ اُٹھا: "لیکن شاعر، خود تمہارے ذہنی راستے اب تک اُلجھے ہوئے تھے۔"

میں نے کہا: "مرے ہمدم، مرے دوست، مرے شاعر، مرے طنز نگار آپس میں یوں مت اُلجھو۔ لوک گیت زندہ باد۔ آؤ ہم مل کر نعرہ لگائیں ــــ گگائے جا، ہندوستان!"

مِل کر پھنسو مچھلیو!

تاڑی کا بڑا سا پیالہ اپنے حلق میں اُنڈیل کر وہ ہمارے اور بھی قریب آگیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے ناس کی بھی دو ایک چٹکیاں سُونگھ رکھی ہیں۔

وہ سر سے پاؤں تک میلا تھا۔ مگر اُس کی آنکھیں آسمان کے تاروں کی طرح بار بار چمک اُٹھتی تھیں۔ اِن آنکھوں میں بے آرامی کا گمان کرنا نِری غلطی ہوتی۔ وہ کہہ رہا تھا "مچھلیاں!... سمندر کی ساری مچھلیاں میری زبان سمجھتی ہیں، میرا حکم مانتی ہیں۔ دِن کو ہی نہیں، رات کو بھی۔ کون کہتا ہے میں پاگل ہوں؟ پاگل! اچھا پاگل سہی۔ بالکل پاگل۔ اری مِل کر پھنسو مچھلیو! مِل کر... اری واہ ری میری مچھلیو! سمندر کی پریو! لہروں کی چنچل زنکیو!......"

وہ تامل بول رہا تھا۔ یہ اُس کی مادری زبان تھی۔ شری نواس آچاریہ میرے ہمراہ نہ ہوتا تو میں اُس ماہی گیر کی باتیں کیا خاک سمجھتا۔ میں شاید یہی سمجھتا کہ وہ یوں ہی بڑبڑاہٹ سے

میرے متعلق ہی کوئی بات پوچھ رہا ہے۔

ساحل کی ریت پر وہ مچھلی کی طرح پھڑکنے لگا۔ شری نواس نے بتایا کہ یہ تامل ماہی گیروں کے کسی پُرانے ناچ کا ٹکڑا ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی ہنسی کو ضبط کیا، اور پھر جب وُہ کھڑا ہو کر انگوچھا گھمانے لگا تو شری نواس بولا: "یہ بھی ایک ناچ ہے.... پرانا ناچ.... سرے سے قدیم!"

ماہی گیر کہہ رہا تھا: "مچھلیاں!... سمندر کی مچھلیاں میری زبان سمجھتی ہیں۔ دن کو بھی اور رات کو بھی.... اری ناہ ری میری مچھلیو، سمندر کی پریو! لہروں کی چنچل ز تکیو!...."

شری نواس ہنس کر بولا: "یہ آدمی سٹھیا گیا ہے۔"

"میں یہ ماننے کو تیار نہیں۔"

مَیں سوچنے لگا کہ ضرور وہ اپنے گاؤں میں سب سے اچھا ناچنے والا رہا ہو گا۔ چڑھتی جوانی میں، جب خوراک کی وجہ سے گھبرو کے ہاتھ پاؤں بھی جلدی جلدی تھکتے نہیں، ہاتھ میں ہاتھ دیے کرناچنے والی رفیقہ کا چہرہ دیکھ کر وہ دائرے کے مرکز میں جلنے والے چراغ کی طرف احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھ لیا کرتا ہو گا۔

شری نواس صرف میری وجہ سے وہاں اتنی دیر بیٹھا رہا۔ ورنہ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ کہتا، میرا تو تاڑی کی بُو سے دم گھٹا جا رہا ہے۔ تاڑی کا اثر ماہی گیر پر ابھی باقی تھا۔ کیا تاڑی سچ مچ بڑی چیز ہے اور ناس بھی؟ مجھے یاد ہے اُس وقت مجھے اُن کی بُرائی بہت زیادہ نہیں کھٹکی تھی۔ میں نے سوچا کہ تاڑی پی کر بے چارے نے اپنا غم غلط کر لیا ہے۔ اسی طرح برسوں سے وہ اپنا غم غلط کرتا آیا ہے۔ ورنہ شاید جیتا جیتا جھیلتا جھیلتا وہ کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا.... اور ناس سونگھ کر وہ اپنا مغز ہلکا کرتا آیا ہے۔ شری نواس کے نزدیک تاڑی پینا ناقابلِ معافی تھا۔ ہاں ناس کا وہ خود بھی عادی تھا۔

یہ وہ ماہی گیر سمجھ گیا کہ میں اس کی زبان نہیں سمجھتا۔ وہ میرے آر پار دیکھنے کی کوشش میں تھا۔ شام کی سُرخی گہری ہو کر دھیرے دھیرے غائب ہو رہی تھی۔ جھٹپٹے کا سماں شری نواس کے دل میں یا میرے اپنے دل میں پہلے ہی غم گھول دے مگر اس ماہی گیر کی صورت میں یہ ممکن نہیں۔ یہ خیال میرے ذہن میں پھیلنے لگا۔

میکسم گورکی نے آپ بیتی میں لکھا ہے ۔ "میرا بچپن گویا شہد کا چھتہ تھا۔ جس طرح مکھیاں وہاں شہد لئے ہوئے آتی ہیں، سیدھے سادے اور گمنام آدمی اپنے اپنے تجربے اور مشاہدے لئے ہوئے میرے پاس آئے اور اپنے تحفے دے کر میری روح کو نہال کر گئے۔ عام طور پر یہ ایک گاڑھا اور کسیلا شہد ہوتا تھا۔ پر وہ بھی علم تھا۔ ہر طرح کا شہد علم ہے۔" میں سوچنے لگا۔ کیا اس ماہی گیر کا بچپن بھی میٹھے اور کڑوے کسیلے شہد سے بل کر بنا تھا؟

صورت سے وہ بزرگ، اور دانش مند معلوم ہوتا تھا۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا آسان نہ تھا کہ اس کی پُر معنی مسکراہٹ میں تاڑی اور ناس کا کتنا ہاتھ تھا۔ وہ ریت پر چت لیٹ گیا۔ یہ بچھونا اُسے بہت بھاتا تھا۔ شری نواس کی چتون سہمی ہوئی تھی۔ اور ٹکٹکی لگا کر وہ اس ماہی گیر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نشہ اُترنے پر ماہی گیر کی آواز بدل گئی۔ اسے سُن کر مجھے فوراً اپنے پھاٹک کا دھیان آیا جس کی چُول یوں چرچرایا کرتی ہے گویا اپنا کوئی پُرانا غم ظاہر کر رہی ہو۔

میں نے کہا۔ "بھائی شری نواس، مچھلیوں کے متعلق کوئی پرانا گیت تو یہ آدمی ضرور جانتا ہوگا۔ پوچھ دیکھتا ہوں۔"

ہر طرف خاموشی چھا رہی تھی۔ صرف سمندر کی لہریں تھیں جو بول بول کر ابھی تھکی نہ تھیں۔ اپنا ہاتھ ماہی گیر کی پیٹھ پر ٹیکتے ہوئے شری نواس نے پوچھا۔ "پوتو ساتو سامی چیٹی! کوئی پُرانا گیت یاد ہو تو سناؤ یار!"

یہی اُس ماہی گیر کا نام تھا۔ پونوسامی چیٹی۔ شری نواس کا ہاتھ پرے دھکیلتے ہوئے وہ بولا، "میں گیت گاؤں!..... واہ بھئی واہ، میں گیت گاؤں!"

شری نواس کا ہاتھ اُس کے ہاتھ کی طرف بڑھا۔ پونوسامی نے بھی اپنا بازو، جو کسی پُرانے درخت کی ٹہنی کی طرح سُوکھ چلا تھا، آگے بڑھا۔ اور وہ بولا "بہت اچھا میں ایک گیت سُناتا ہوں جسے گاتا گاتا میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔"

"یہ گیت کس وقت کا ہے؟"

"میں نے اسے اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ اس نے اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ اُس نے اپنے باپ سے سیکھا ہوگا کس وقت کا ہے؟ — اس سوال کا جواب میرے پاس کوئی نہیں۔"

"اچھا پہلے یہ تو بتادو کہ یہ کس وقت گایا جاتا ہے؟"

"یہ بیچ سمندر میں گایا جاتا ہے۔ جب ہم اپنے جال لہروں پر پھینکتے ہیں تو مچھلیوں کو دعوت دیتے ہیں۔"

یہ بھی پتہ چلا کہ ماہی گیر تیس چالیس میل تک سمندر میں چلے جاتے ہیں۔ ایک کشتی ایک شکار میں عموماً دس روپے کی مچھلیاں پکڑ پاتی ہے۔ اور کبھی کبھی کوئی خوش قسمت ماہی گیر دس کی بجائے تیس روپے تک پہنچ جاتا ہے۔ چھوٹے لڑکوں کو مچھلی پکڑنے جاتے ہوئے ساتھ لے جانے کا رواج اُن کے ہاں بالکل نہیں ہے۔ سگائی ہونے پر لڑکا پہلی بار کا شکار اپنی ہونے والی بیوی کے روبرو لا رکھتا ہے۔ اور ان مچھلیوں کو دیکھ کر دُلہن اپنے رفیق کی گرویدہ ہو جاتی ہے۔ سگائی کے بعد لڑکی خود اپنے رفیق کو شکار پر جانے کی تلقین کرتی ہے، کیونکہ شادی کی رسم کے لئے یہی سب سے ضروری شرط ہوتی ہے۔

پھر پونوسامی چیٹی نے یوں گانا شروع کیا:۔

"کوڑی واکوڑی واکاولالی　　　　کوٹ مٹ نل وینڈم کاولالی"

"شیرندو مارے ویندُم کاولالی — شین اِٹ تل ویندُم کاولالی"
"تیماو ولیلی اِیلنج نیرونیتر واڑہ اولیلی — وِلنج نیرون ہیں نِے وِلنج نیرون ملیٹے"
"ننگن تالمئی اوڑت اُنگا پدومئی گلئی پار کاوندوم
ننگن تالئی اوڑت اُنگا پُدومئی گلئی پار کاوندوم"

کٹ چرو کتّی وندوم — کن کانا شیھئی وندوم
پونڈو پائی پل اِکّ وندوم — اُنگ پدمئی گلئی پار کاوندوم
پیت لیچی پارت ورچوناّلے — شرتئی مئی ری شمند ورچوناّلے
"تُلّی ولئی یاڑ توئی اونرو کونڈو وندین
پانجو ولئی یاڑ پدومئی اونرو کونڈو وندین"

اوتّی پل وی اُڑا اوڑی کرنی شیرو ویندُم — مِناّلے پٹ کرن پناّلے تیر کاونیم
پیلی کارنی لیٔ ران پیرتے کچّاو لیٔ نیم — شاری کاڑن لیٔ ران شرنج کچّاو لیٔ نیم
کنی کلیہ ونیم کاتونول کٹ نیم — کنگنم مودی زنگل کئی اِل دُرک ونیم
"ڈینبلیپئی اوڑت اُنگا دیرہ کت پئی پارکت وندوم
پنگنت اوڑت اُنگا پُدومئی گلئی پارکت وندوم"

وڑکتّی پونگام ولنج ورشونیں گگام — تیکتّی پونگام ترمبی ورشونیں گگام
اودئی پول وگگام اوڑی ندو تیر وشیٹام — پنجو پول وگگام پل مام تانگا دے
کمب کونم ونیہ تولایام کوتی مارمیدئیڈ — مائے ودم ونیہ تولایام مامی مارمیدئیڈ
دووٹ پونگ لیٔام اُنگلئی ترقی ورچو ناّلے
کانت پونگ لیٔام کمنڑ ورچو ناّلے
"کوڑی واکوڑی واکاولالی — کوتش ہت تل ویندُم کاولالی"

—— مل کر آؤ۔ مل کر آؤ (مچھلیو!)، او (میرے) محافظ! مچھلیوں کی ٹولی بنا کر (میرے روبرو) دھکیل دینی چاہیئے۔ او (میرے) محافظ!

—— مل کر (مچھلیوں کو) جمع ہونا چاہیئے۔ او میرے محافظ! (اُن کی) فوج بنا کر (میرے روبرو) دھکیل دینی چاہیئے۔ او (میرے) محافظ!

—— ارے او بڑے مچھ، صاف پانی کے اور گرم پانی کے مچھ! آؤ۔ بھنور کی سفید مچھلی! او بھنور کی سفید مچھلی! (آؤ)

—— تنگم درخت کے پتے توڑ کر ہم "جاتی تنگم"[1] لے آئے ہیں۔ تنگم درخت کے پتے توڑ کر ہم تمہارے نئے نئے جلوے دیکھنے آئے ہیں۔ (اری مچھلیو!)

—— ہم بھات کی پوٹلی باندھ کر آئے ہیں۔ ہم اَن دیکھے دیس میں آئے ہیں۔ (اری مچھلیو!)

—— ہم بیوی بچوں کی پرورش کے لئے آئے ہیں۔ ہم تمہارے جلوے دیکھنے آئے ہیں (اری مچھلیو!)

—— بیوی نے تمہیں دیکھ کر لوٹنے کو کہا ہے۔ (اس گھنگھریلے بالوں والی نے تمہیں اُٹھائے ہوئے لوٹنے کے لئے کہا ہے۔ (اری مچھلیو!)

—— (تمہارے) کودکر کھیلنے کو ایک کُنڈ لایا ہوں۔ (تمہارے) جھپٹ کر کھیلنے کو ایک کڑا یا لایا ہوں (اری مچھلیو!)

—— (ہمارا) بیڑا سوراخ سوراخ ہے، تیزی سے ساحل پر پہنچنا چاہئے۔ پہلے کا کھایا ہوا قرض پیچھے سے چکانا ہوگا۔

---

[1] ماہی گیروں کی کوئی خاص نشانی۔

— دبڑا" پیلی کارن" مچھ گھوم رہا ہے۔ (خدا کرے) بڑا جال اُسے پھنسا لے۔

"شارڑی کارن" مچھ گھوم رہا ہے۔ تیزی سے جھپٹ کر جال اُسے پھنسا لے۔

— (مجھے) بیاہ کی رسم ادا کرنی ہوگی اور کنگنا باندھنا ہوگا۔ "کنگن" اور انگوٹھیاں ہاتھ میں پہننا ہوں گی۔ (اری مچھلیو!)

— نیم کے پتے توڑ کر ہم تمہارے تماشے دیکھنے آئے ہیں۔ "پنگم" درخت کے پتّے توڑ کر ہم تمہارے نئے نئے جلوے دیکھنے آئے ہیں (اری مچھلیو!)

— شمال کی عورتوں نے تمہیں گھیر کر لانے کو کہا ہے۔ جنوب کی عورتوں نے ہمیں جلد گھر لوٹنے کو کہا ہے۔ (اری مچھلیو!)

— سُرخ سُرخ ہیں ہمارے بیڑے۔ بہت جلد ہمیں ساحل پر پہنچنا ہوگا۔ کپاس جیسے سفید ہیں ہمارے بیڑے۔ یہ تو تمہارے حملوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ (اری مچھلیو!)

— کمُب کونم شہر بہت دُور ہے۔ وہاں بیسواؤں کے بالاخانے ہیں۔ ہائے ورم شہر بہت دُور ہے۔ وہاں (ہماری) خالاؤں[1] کے بالاخانے ہیں[2] (اری مچھلیو!)

— دُور دُور کی لڑکیوں نے تمہیں گھیر کر لانے کو کہا ہے۔ جوان کنواریوں نے تمہیں دیکھ کر لوٹنے کو کہا ہے (اری مچھلیو!)

---

[1] خالہ سے مُراد ہے ساس۔ کیونکہ جنوبی ہند میں ماموں کی لڑکی سے شادی کرنے کا عام رواج ہے۔

[2] ماہی گیروں کی یہ بات اُن کی ہوشیاری کی ترجمانی کرتی ہے۔ کہتے ہیں "ہم تمہیں دیکھ تو لیں" جب مچھلیاں اُن کے روبرو آئیں گی وہ جھٹ اُنہیں اپنے جال میں پھنسالیں گے۔

—— بل کر آؤ رمچھلیو!، او میرے محافظ! مچھلیوں کی ٹولی ہانک کر میرے روبرو دھکیل دینی چاہیے۔ او میرے محافظ!

گیت ختم کرتے ہی پوتو سامی چپٹی ریت پر چت لیٹ گیا۔ شری لنکا اس یوں ہل رہا تھا جیسے کسی کشتی میں جھونکے کھا رہا ہو۔ پوتو سامی چیٹی کے گیت کی ٹیک میرے کانوں میں برابر گونج رہی تھی —— "بل کر آؤ۔ بل کر آؤ رمچھلیو!۔۔۔"

چمبہ کی پہاڑیوں میں

چمبہ میں جاکر دیکھا کہ راوی ٹھیک اُس جوان لڑکی کی طرح ہے جس کا ابھی بیاہ نہ ہُوا ہو، اور جو ابھی میکے ہی میں کھیل رہی ہو۔ لاہور میں تو راوی بچیوں کی ماں معلوم ہوتی ہے — گرہست کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی، جو یا تو گمبھیر رہتی ہے یا بُری طرح کرودھ میں آجاتی ہے۔

ایک ملاقاتی نے بتایا کہ چمبہ کے ایک پُرانے لوک گیت میں کوئی برہن کہتی ہے: "میرا پیا پردیس میں ہے راوی اور تو اُچھل اُچھل کر ناچ ناچ کر بہتی ہے برکھا رُت میں۔ ایک برہن کی پیڑ کو تو کیا جانے۔ ہاں تو عورت کے ناطے ہی سہی۔ میرا پیا آئے تو اُسے راستہ دے دینا راوی!" لیکن جتن کرنے پر بھی اُس گیت کے اصل بول نہ مل سکے۔ راوی اپنی الھڑ، کنواری چال سے بہہ رہی تھی۔ نہ اُسے کسی برہن کی فکر تھی نہ اُس کے پیا کی۔

چمبہ کی پہاڑی سُندرتا جتنی من موہنی تھی یہاں کا بازار اُسی قدر بھدا تھا۔ یہاں کا چوگان — گھاس کا وہ نصف میل لمبا اور کوئی اسّی گز چوڑا میدان، جتنا کھلا تھا، ہر دکاندار کا دِل شاید اُسی قدر تنگ تھا۔ نہ کسی دُکان کا مُنہ نہ سر، ہر چیز اپنی قسمت پر نالاں، قیمتیں کم مگر خرید و فروخت بے جان۔ نہ جانے کس نے ان لوگوں کو دُکاندار بنا دیا تھا؟ لوچ تو اُن کی آواز میں نام کو نہ تھا۔ سنگیت کی نسبت شاید اُنہیں بھُوتوں کی کہانیاں ہی زیادہ بھاتی تھیں۔ کسی کسی کا دل تو سدا کے لئے بجھ چکا تھا — یکایک فیوز ہو جانے والے بجلی کے قمقمے کی طرح!

خوش قسمتی سے ایک طالب علم سے ملاقات ہو گئی جو لاہور تک ہو آیا تھا۔ بھُوری سنگھ عجائب گھر سے لوٹ کر ہم چوگان میں بیٹھ گئے۔ اس کے شمالی سرے پر ریاست کے ہسپتال نے تصویر کھینچ رکھی تھی۔ مشرق کی طرف حاضری باغ تھا جس سے تھوڑا ہٹ کر بازار شروع ہو جاتا تھا۔ ہم چوگان کے مغربی سرے پر بیٹھے تھے جہاں سے اس کی نصف لمبائی تک راوی کا منظر سامنے تھا اور چوگان گیٹ بھی کچھ کم خوبصورت نہ تھا جس کے قریب ہی ڈاک خانہ اور تار گھر کھڑے تھے۔ آگے پھر دُکانوں کی قطار شروع ہو جاتی تھی جو کوتوالی تک چلی گئی تھی۔ اسی کوتوالی سے متّصل بھُوری سنگھ عجائب گھر ہے۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے مَیں نے ایک بار پھر یہاں کے تنگ دِل دُکانداروں کے ساتھ چمبہ کے کھُلے چوگان کا موازنہ کر لیا تھا۔

وہ بولا۔ "اگر مَیں کہوں کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں لارڈ اور لیڈی کرزن ۱۹۰۰ء میں جب وہ چمبہ میں تشریف لائے تھے، آن بیٹھے تھے تو آپ حیران مت ہو جائیے۔ یہ سچ ہے۔ میرے دادا گواہ ہیں۔ اُنہوں نے خود اُنہیں اسی جگہ بیٹھے دیکھا تھا۔"

وہ بولا ۔ "میرے دادا یہاں بیٹھ کر اکثر وُہ دوہا رٹا کرتے ہیں ۔۔۔ "چمپا تجھ میں تین گُن سُندر، سُکھ، سُباس ۔۔۔ اوگُن تجھ میں ایک ہے، بھرِ ص نہ آوے پاس ۔" چمپا کے پھول ادھر بہت کھِلتے ہیں ۔ یہ جگہ اسم بامسمّٰی ہے ۔ نہ جانے کیوں میرے دادا اتنا بھی نہیں سمجھ پاتے کہ چمپا پر کوئی بھونرا آئے نہ آئے چمبہ کو بھونروں کی کمی نہیں ۔ ایک دن ہندوستان کا وائسرائے اپنی بیوی سمیت بھونرے کی طرح یہاں چلا آیا تھا، تو آج ایک خانہ بدوش بھونرا اپنا اِدھر آ نکلا ہے ۔"

"خُوب خُوب" میں نے کہا ۔ "بھئی یہ تم نے ایک ہی کہی ۔"

چمبہ ریاست کا مستطیل نما نقشہ میرے ہاتھ میں تھا ۔ شمال میں یہ مستطیل کسی حد تک ٹکرا گیا تھا ۔ جنوب مغرب سے شمال مشرق تک اس کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ۷۰ میل تھی اور جنوب مشرق سے شمال مغرب تک زیادہ سے زیادہ چوڑائی ۵۰ میل ۔ بیاس کی وادی کا ایک ٹکڑا، کچھ حصّہ راوی کی وادی کا جو خاص چمبہ کی وادی کہلاتی تھی اور چناب کی وادی کا کچھ حصّہ جو پانگی اور چمبہ لاہُل پر مشتمل تھا ۔۔ یہ تھی چمبہ ریاست ۔۔۔

"۳،۰۰۰ فٹ سے ۲۱،۰۰۰ فٹ تک، اُٹھتے گئے ہیں ہمارے پہاڑ" وہ بولا ۔ "آبادی ۱۰،۰۰۰ فٹ تک ہی ملتی ہے ۔"

بہت دیر تک چمبہ کی تاریخ کے متعلق باتیں ہوتی رہیں ۔ پتہ چلا کہ یہ ہندوستان کی قدیم ترین ریاستوں میں سے تھی ۔ سنہ ۶۰۰ء سے پہلے ہی اس کا سنگِ بنیاد رکھا جا چکا تھا شروع میں کوئی ۴۰۰ سال تک برہمور راجدھانی تھی ؛ چمبہ کے جنوب مشرق میں ۴۸ میل پر واقع ہے ۔ راجہ ساہل ورما کے زمانے میں چمبہ کی بنیاد رکھی گئی اور راجدھانی اُٹھ کر یہاں چلی آئی ۔ ساہل ورما کی شہزادی چمپاوتی کو یہ جگہ بہت پسند تھی اور اسی کے نام پر

اس کا نام چمپا یا چمبہ رکھا گیا۔

چمبہ کے مندر بہت پرانے ہیں، جتنے پرانے ہیں اُتنے ہی سندر ہیں۔ خود ساہل ورما نے چمبہ میں سب سے پہلے چمپاوتی یا چمپنی مندر بنوایا تھا۔ روایت ہے کہ چمپاوتی کے وچار بہت دھارمک تھے، اور وہ ست سنگ کے لئے ایک سادھو کے آشرم میں جایا کرتی تھی۔ راجہ کو شبہ ہو گیا اور وہ تلوار میان سے نکال کر پیچھے پیچھے گیا لیکن آشرم میں جا کر دیکھا کہ نہ شہزادی ہے نہ سادھو۔ آواز آئی "راجن تیرا سندیہ اترتھ ہے چمپاوتی تردوش ہے۔ اب چمپاوتی نے مکتی پالی اور وہ چمبہ کی دیوی ہے"۔ اُس کے نام پر راجہ نے اپنے خزانے سے ان گنت مہریں خرچ کرنے کے بعد ایک مندر بنوایا۔ تب سے چمپاوتی اس ریاست کی سب سے بڑی دیوی مانی جاتی ہے۔

ایک اور روایت نے چمپاوتی کی ماتا کو ستی کے روپ میں امر کر رکھا ہے۔ کہتے ہیں چمبہ میں راجدھانی چلی تو آئی مگر پینے کے پانی کی سخت تکلیف رہی۔ چنانچہ راجہ ساہل ورما نے سروت ندی سے پانی لانے کی تجویز سوچ نکالی اور جلد ہی ایک نہر تیار کی گئی جو شہر کے اوپر سے اس پہاڑی کے گرد گھومتی ہوئی آئی تھی جسے اب شاہ مدار کہتے ہیں لیکن پانی تھا کہ اس نہر میں داخل ہی نہ ہوتا تھا۔ پنڈتوں نے بتایا کہ سروت ندی کی دیوی ناراض ہے اور اُسے خوش کئے بغیر پانی نہ آئے گا۔ پنڈتوں نے یہ بھی بتایا کہ خود رانی یا شہزادے کی بلی دیئے بغیر یہ کام نہیں ہونے کا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ راجہ کو سپنے میں خود سروت ندی کی دیوی نے درشن دیئے اور کہا کہ اپنے پتر کا بلیدان دو۔ اور بعد ازاں جب رانی کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے پتر کی بجائے اپنا بلیدان دیئے جانے پر زور دیا۔ راجہ چاہتا تھا کہ نہ شہزادے کی بلی دی جائے نہ رانی کی بلکہ کسی تیسرے آدمی کی بلی دے کر

دیکھا جائے کہ دیوی کسی طرح خوش ہو جاتی ہے یا نہیں۔ آخر رانی کا اصرار کامیاب رہا۔ اپنی و ...یوں سمیت ننگے سر اوپر پہاڑی پر بلوت گاؤں کے قریب پہنچی جہاں سے یہ نہر شروع ہوتی تھی۔ روایت کہتی ہے کہ رانی کو وہاں زندہ دھرتی میں دفنا دیا گیا اور پانی جھٹ نہر کی طرف بڑھ آیا۔ اور اس کے بعد سروت ندی کی دیوی کبھی ناراض نہیں ہوئی، اور آج تک چمبہ والے اسی ندی کا پانی پیتے آئے ہیں۔

"اس رانی کا نام کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نینا دیوی" وہ بولا۔ "اب ہمارے ہاں نینا دیوی کا مندر بھی موجود ہے۔"

اور ہم نینا دیوی کا مندر دیکھنے کے لئے چل پڑے۔ راستہ بہت سی سیڑھیوں سے ہوتا ہوا اوپر چڑھتا گیا اور جہاں سیڑھیاں ختم ہوتی تھیں ایک چھوٹا سا مندر رکھا تھا۔

"اسے خود راجہ ساہل ورمانے بنوایا تھا" وہ بولا "اور تب یہاں ہر سال میلہ لگتا ہے۔ بھدرہ چیت سے یہ میلہ شروع ہوتا ہے اور یکم بیساکھ تک جاری رہتا ہے، اور پھر یکم بیساکھ سے ۲۱ بیساکھ تک نیچے چمپاوتی کے مندر میں میلہ لگتا ہے۔ چمبہ بھر کے لوگ ان میلوں پر یہاں آتے ہیں اور اپنے من میں نینا دیوی اور چمپاوتی کی تصویروں کو چھپائے رہتے ہیں۔ آپ بھی کبھی شروع چیت میں ادھر آئیے اور ان دونوں میلوں کو دیکھئے۔ ان میں آپ کو چمبہ بھر کا دل دھڑکتا محسوس ہوگا۔"

"بھلا یہ تو بتاؤ" میں نے کہا "کہ نینا دیوی کا مندر یہاں کیوں بنایا گیا؟"

"یہی وہ جگہ ہے" اس نے بڑے یقین کے ساتھ کہا "جہاں رانی نے بلیدان کے لئے جاتے وقت آرام کیا تھا۔"

میں نے سوچا کہ ضرور آرام کیا ہوگا کیونکہ ہم خود بھی تو سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے تھک

گئے۔ تھے۔ پتہ چلا کہ اُن دنوں ابھی یہ سیڑھیاں بھی نہ بنائی گئی تھیں۔ میرے دوست نے یہ بھی بتایا کہ بنّا دیوی کا میلہ "سُوہی میلہ" کہلاتا ہے اور اس پر عورتیں اور بچّے ہی زیادہ جمع ہوتے ہیں۔ نئے سے نئے کپڑے، نئے سے نئے رنگ، ہر کوئی پھُول چڑھاتا ہے اور رانی کی مہما کے گیت گاتا ہے۔ اور راج گھرانے کی طرف سے سب کا سنکار ضروری ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ سُوہی میلہ کی تاریخوں میں کسی طرح کی رُکاوٹ نہیں پڑ سکتی۔ یہاں تک کہ اگر کسی میلے کے دوران میں راج گھرانے میں کوئی موت واقع ہو جائے تو اور کوئی بھی میلہ بند کر دیا جاتا ہے مگر سُوہی میلہ پر یہ اصُول لاگو نہیں ہوتا۔

"ساری ریاست میں صرف ایک ہی تو شہر ہے" میں نے کہا۔ "بھلا کُل گاؤں کتنے ہوں گے؟"

"ساڑھے سولہ سو سے زیادہ" اپنے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے وہ بولا۔ "یہ سب گاؤں کوئی تین درجن پرگنوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ چمبہ شہر میں تو ۶۰۰۰ آدمی ہی بستے ہیں۔ یہ ہماری کُل آبادی ڈیڑھ لاکھ سے کچھ ہی کم ہو گی۔ ریاست کا انتظام پانچ وزارتوں یا عملوں میں بٹا ہوا ہے۔۔۔ پانگی، چمبہ، چُراہ، بھٹّیات اور برہمور۔"

"تم نے چمبہ کا چپّہ چپّہ دیکھا ہو گا" میں نے پُوچھا۔

"جی ہاں" وہ بولا۔ "اور اب آپ کے ساتھ چلوں گا جہاں بھی آپ لے چلیں!"

"بہت خُوب!" میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

مشرق کی طرف مُنہ کئے، ڈلہوزی سے چمبہ تک ۱۹ میل کا سفر میں نے تن تنہا طے کیا تھا اور ڈلہوزی اور چمبہ کے عین درمیان کھجیار جھیل کے ۱۲ فٹ گہرے پانی میں اپنا چہرہ دیکھتے وقت بھی میں اکیلا تھا۔ یہاں تک کہ یہاں کے قدیم دیوتا کھجی ناگ کا پجاری

بھی مندر میں حاضر نہ ملا۔ لیکن اب میرا دوست دھنتی میں لہراتی ایال کی طرح میرے قریب تھا۔ اور ہم دُنیا بھر کی باتیں لے بیٹھتے تھے۔ اُس کی آنکھوں کو دیکھ کر مجھے دو فاختاؤں کی یاد آ جاتی جو مجھے دیکھتے ہی کھجیار کی جھیل کے کنارے سے اُڑ کر اس جھیل کے تیرتے جزیرے پر جا بیٹھتی تھیں۔ پہاڑیوں کے بدلتے ہوئے منظروں میں ہماری آنکھیں یکساں طور پر کھُب جاتی تھیں۔

اُترائیوں چڑھائیوں کے چکّر کاٹتی ہوئی پانگی کی سڑک اُوپر کو اُٹھتی جاتی تھی کنارے پر رنگ رنگ کے پھُولوں کی چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ یہ پھُول دیکھ کر جیسے میری رُوح سے جسم کا بوجھ سا اُترتا جاتا تھا۔ ساچ کی بلند برفانی گھاٹی آنے سے پیشتر ہی میرے دوست نے بتا دیا تھا کہ اسے مکمل خاموشی میں پار کرنا ہوگا۔ ورنہ اگر کنواری برفوں کی دیوی بھگوتی ناراض ہو جائے تو اُوپر سے برف کی چٹان گرے گی، اور ہم برف کی قبر میں سو جائیں گے ہمیشہ ہمیشہ کی نیند۔ کنواری برفوں کا وہ منظر مجھے کبھی نہ بھُولے گا۔ چمبہ کا پُرانا لوک گیت یاد آ گیا جس میں ایک عورت کسی افسر سے یہ درخواست کرتی ہے کہ اُس کے شوہر کی بدلی پانگی میں نہ کی جائے۔ کیونکہ نہ اُس کے پاس چپل ہے نہ موزے۔ ننگے پاؤں وہ کیسے برفانی گھاٹی کو پار کرے گا۔ جاڑے میں پانگی اپنے برف کے کواڑ بند کر لیتی تھی اور باقی دُنیا سے اس کا رشتہ ٹوٹ کر رہ جاتا تھا۔ چندر بھاگا کو دیکھ کر میں نے کہا۔ بہتی جا شوق سے چندر بھاگا آگے پنجاب میں جانے کتنی ہیریں اور کتنی سوہنیاں تجھے اپنے عشق کے ناکام کھانے کو تیار ملیں گی اور وہاں تیرا نام بدل جائے گا۔ چندر بھاگا! پانگی میں ہم نے ہفتے گزارے۔ قدم قدم پر پانگی ہمیں خوش آمدید کہتی محسوس ہوتی تھی۔

پانگی سے لوٹ کر ہم نے گدیرن کی سیر کی۔ بر ہوم وزارت ہی کو گدیرن کہتے

تھے کیونکہ ادھر گدی لوگ بہت تھے۔ گدی عورتوں کے چہروں کی تلاش دیکھ کر مجھے بار بار کانگڑہ قلم کا دھیان آ جاتا۔ چمبہ اور کانگڑہ کا تمدن ایک ہی تھا۔ وہ سب مصور انہیں عورتوں کے بیٹے تو تھے۔ ہر سال نومبر میں برف گرنے سے پیشتر گدی لوگ اپنی بھیڑ بکریوں سمیت چمبہ کی وادی میں اتر آتے تھے یا دھول دھار کی برفانی گھاٹیوں کے اس پار کانگڑہ کی طرف نکل جاتے۔ اور اپریل یا مئی میں برفوں کے پگھل جانے پر اپنے وطن کو لوٹتے۔ نوکھی گدن کا گیت ہر گدی کو یاد تھا۔ نوکھی اپنے زمانے کی بے نظیر حسینہ تھی اور کانگڑہ کے راجہ سنسار چند نے اُسے زبردستی اپنی رانی بنایا تھا۔ شاید سنسار چند کو جہانگیر سے بھی زیادہ دِقّت پیش آئی ہوگی کیونکہ نوکھی گدن اپنے گدی کو بھولتی ہی نہ تھی اور نورجہاں کی طرح وہ بدھوا تو تھی ہی نہیں۔

گدیرن کے بعد ہم راوی کے نکاس کی طرف چل دیئے لیکن راستے ہی سے لوٹ آئے۔ چمبہ کا وہ "منجراں کا میلہ" کتنا عجیب تھا۔ "منجر" اس ریشمی پھندنے کا نام تھا، جسے ریاست کے مہاراج سے لے کر چھوٹے سے چھوٹا آدمی اپنی پوشاک میں کہیں نہ کہیں ٹانک لیتا تھا۔ یہ سب راوی کو خوش کرنے کا سامان ہی تو تھا۔ صدیوں سے لوگ راوی کے کنارے جمع ہوتے آئے تھے۔ ساون کے تیسرے اتوار کے روز مہاراج اپنے وزیروں سمیت موقع پر تشریف لاتے تھے۔ اور راوی کی بھینٹ کیا جانے والا بھینسا پہلے ہی سے وہاں کھڑا رکھا جاتا تھا۔ ریاست کے پربندھ سے۔ اِدھر مہاراج اپنے ہاتھوں سے ایک ناریل ایک روپیہ ادوب گھاس اور کچھ پھولوں کا اُپہار راوی کی بھینٹ کرتے اور اُدھر اس بھینسے کو پانی میں دھکیل دیا جاتا۔ سب یہی چاہتے تھے کہ یہ بھینسا بہہ جائے یا غرق ہو جائے اور اگر وہ پانی سے نکلنے میں کامیاب ہو بھی تو

دوسرے کنارے پر نکلے تاکہ اس کا یہ مطلب سمجھا جا سکے کہ سب کے پاپ دوسرے کنارے جا لگے ہیں۔ لیکن اگر کسی طرح یہ بھینسا اسی کنارے پر نکل آتا تو سب سہم جاتے تھے کیونکہ راجا اور پرجا کے لئے اس سے بڑی بدشگونی اور کوئی نہ ہو سکتی تھی۔ اور اس صورت میں اس بھینسے کی ریاست کے پربندھ میں اگلے سال تک پھر پرورش کی جاتی تھی تاکہ ایک بار پھر اُسے راوی کی بھینٹ کیا جائے۔ یہ میلہ شاید پراچین دھرتی پوجا کا نشان تھا یا پھر سورج پوجا کی یادگار کیونکہ ہمیشہ سے اتوار ہی کو یہ میلہ لگتا آیا تھا۔

ناچتا گاتا ہجوم راوی کے کنارے سے ہٹنے کا نام نہ لیتا تھا۔ بھینسا پانی میں بہہ گیا تھا۔ راوی نے یہ وشواش دلا دیا تھا کہ خوب بارشیں ہوں گی اور فصلیں کامیاب رہیں گی اور دونوں راجہ اور پرجا سکھ ہی سکھ دیکھیں گے۔ رچتا بچتا لوک ناچ بار بار نئے کے نشے میں کھو جاتا اور معلوم ہوتا تھا کہ آج ہر جنگل پہاڑ اور دریا کے دیوی دیوتا جنہیں یہ لوگ صدیوں پوجتے آئے تھے، ابھر آنکلے ہیں، اس لوک ناچ میں شامل ہو گئے تھے، اور جیسے ذات پات کی تمیز بھی اُٹھ گئی ہے، نہ کسی گدی کو اپنے کھتری ہونے پر ناز تھا، نہ کسی کولی، ہالی، سپی یا چمار کو اپنے اچھوت ہونے پر شرمندگی۔ ڈومنا بروالا، میگھ، ورنیں، ریہار، سرار، لوہار، بھٹ وال اور دھوگری ——— یہ سب لوگ اب اچھوت نہ تھے بلکہ راٹھیوں، راجپوتوں اور برہمنوں کے بھائی بند تھے۔ اور خاص چمبہ کی چمیالی یا چمبالی بولی برہمور وزارت کی برہموری یا گادی یعنی گدیوں کی بولی سے، بھٹیات وزارت کی بھٹیالی بولی سے، چراہ وزارت کی چراہی زبان سے اور پانگی وزارت کی پنگوالی سے بولی گلے مل رہی تھی۔ سبھی پر پنجابی رنگ نمایاں نظر آتا تھا۔ چمبہ لاہل کی لاہلی بولی چمیالی سے ہاتھ ملا رہی تھی۔ یہ لوک ناچ کا نشہ

تھا، لوک سنگیت کا نشہ تھا۔

اور چمیالی زبان کا قدیم گیت فضا میں گونج رہا تھا:۔

"چمبے ویٹے دھارا گج گج پالا

چھڈ کے نہ جائیں البیلوا ہو!"

— چمبہ کی پہاڑیوں میں گز گز پالا پڑتا ہے

مجھے چھوڑ کر نہ جانا، البیلے ساجن!

میرے دوست نے کہا: "جیسے نافے میں کستوری جنم لیتی ہے اپنی قدرتی مہک کے ساتھ یا جیسے اخروٹ میں گری پیدا ہوتی ہے۔ ویسے ہی لوک گیت۔ کے سیپ میں ابدی شاعری کا موتی جنم لیتا ہے۔"

اور میں نے مسکرا کر اس کی جادو بیانی کی داد دی۔

جاڑے کا یہ "گز گز پالا" کوئی آج کی چیز نہ تھا۔ چمبہ کی پہاڑیاں اسے جانتی تھیں۔ خود چمبہ شہر بھی، جو صرف ۳۰۰۰ فٹ اونچا تھا۔ اور جہاں جاڑے میں کئی کئی بار برف پڑتی تھی، اسے جانتا تھا۔ اور ان لوگوں کی ضعیف الاعتقادی پر نازاں لیکن اُن کے سپنوں پر رکھتی ہوئی الھڑ کنواری راوی بہہ رہی تھی۔

گونڈوں کے جنگل میں

"سب سے زیادہ مجھے اس کا نام ہی ناپسند تھا۔" دُکال" یعنی قحط۔ صدیوں کی بھوک، صدیوں کی غریبی اس کے چہرے پر پڑھی جا سکتی تھی۔ "بس یہ جنگل ہی ہماری ماں ہے۔ یہی ہمارا باپ ہے۔" وہ بولا۔ "اُسی نے ہمیں جنم دیا، اُسی نے ہمیں اپنا دُودھ پلایا۔ اسی نے ہمیں اپنی لوریاں دے دے کر سلایا اور جگایا۔ اور اب اس جنگل کو چھوڑ کر ہم کہاں جائیں گے؟"

درختوں کی یہ ترتیب شروع سے چلی آئی تھی اور دکال بھی تو گویا ایک درخت تھا۔ چلتا پھرتا درخت۔ یہی جنگل وہ مدھوبن تھا جہاں دکال نے اپنے کنوارے پیار کے گیت گائے تھے۔ لیکن یہ جنگل بھیانک بھی تو تھا۔ ابھی کوئی شیر یا چیتا سامنے سے نکل آئے اور آدمی کے بیٹے سے دُنیا بھر کے شکاریوں کا بدلہ لینے پر آمادہ ہو جائے۔ لیکن دُکال کا خیال تھا کہ شیر اور چیتے یُونہی کسی پر حملہ نہیں کرتے۔ نہیں

بھی بھوک لگتی ہے۔ وہ بھی بڑی مشکل سے زندہ رہتے ہیں۔ آدمی کے بیٹوں ہی کی طرح جنگل کے پرندے بھی انسان اور حیوان ہی کی طرح جنگل کے بیٹے تھے۔ جنگل گویا اپنے بازو بڑھا کر ڈکال کو تھپکیاں دیتا رہتا تھا تاکہ وہ بہت دُور نہ نکل جائے۔ جنگل کو چھوڑنا تو موت کا ہم معنی تھا۔

الاؤ کے قریب ڈکال تانبے کا بُت معلوم ہوتا تھا۔ وہ رتجگا مجھے ہمیشہ یاد رہیگا لکڑیوں کے چٹخنے سے ہماری گفتگو کو ایک قدرتی تال ملتا رہتا۔ بیچ بیچ میں ڈکال کی آواز جنگل کی سرگوشیوں کی ہم پایہ ہو اٹھتی۔ کبھی اس سے کسی چشمے کی ترل رِل ترِل رِل کا گمان ہوتا اور کبھی یہ کسی لوک گیت کے سروں میں بدل جاتی۔ اپنے قبیلے کی خوشی غمی کا تذکرہ وہ بس اسی رات کے خاموش لمحوں میں سُنا دینا چاہتا تھا۔ ڈکال غریب تھا لیکن روز روز کی بھوک اور غریبی کے باوجود اس کی ہنسی میں چاندی لگی ہوئی تھی۔ جنگل اور پہاڑ اور وادی کی اپنی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ پُوری پہچان کے لئے کافی وقت چاہئے۔ ساگوانوں کو رات کی تاریکیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ لیکن میری نگاہ ان گھنی گھنی تاریکیوں کو چیرتی ہوئی ان گوناگوں نقش و نگار تک جا پہنچتی تھی جو ان سب درختوں کے ریشوں پر قدرت کا ادبی فن کار ہمیشہ سے بناتا آیا تھا۔ برما کے ساگوانوں کی یہ خاصیت نہ تھی۔ معاً میری آنکھوں کے سامنے وہ خوبصورت میز بھر گئی جس کی سطح پر ساگوان کے ریشوں نے گھنے گھنے بادلوں کے نیچے نربدا کے پانیوں کا منظر پیش کر رکھا تھا۔ اور اب ان ساگوانوں کی ابدی شخصیت میرے ذہن میں اُجاگر ہو اٹھتی جو چترکاروں کی سی اہمیت رکھتے تھے۔

یہ جنگل کتنا قدیم تھا۔ آریوں سے بھی قدیم۔ پُرانے وقتوں میں اِس دیس کو

جنگلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ پھر جنگل کٹتے گئے۔ تہذیب نے بھی کئی روپ دھارن کئے لیکن کچھ جنگل بچ گئے اور ان جنگلوں میں پرانی تہذیب کی امانتدار کچھ قدیم النسل قومیں بھی بچ گئیں۔ جن میں سے اکیلے گونڈوں کی تعداد کوئی تیس لاکھ ہو گی۔

وسطِ ہند کے جنگل گونڈوں کی جنم بھومی ہیں۔ چھندواڑہ کی جاگیریں جہاں ملیریا کی بھرمار ہے۔ بیتول کی ندیوں کے کنارے کے جنگل جہاں ویاس بھرگو اور اگست نے برسوں تپسیا کی تھی۔ یہ سب گونڈوں کا وطن ہے۔ دکال تو میرا جنم جنم کا بھائی تھا۔ وُہ اتنا ہی ہندوستانی تھا جتنا میں۔ اُس کی آتما میں جھانکتے جھانکتے میں نے محسوس کیا کہ میں اپنی جنم بھومی کو لوٹ آیا ہوں۔

لیکن شروع میں گونڈ دکن کے باسی تھے۔ ستپُڑا کی دشوار پہاڑیوں کو پار کرتے ہوئے گوداوری کے کنارے کنارے یہ لوگ اُوپر کو بڑھتے آئے اور وسطِ ہند میں آ پہنچے۔ چودھویں صدی کی تاریخ گونڈ راجاؤں کے حالات بڑی شان سے بیان کرتی ہے۔ بیتول چھندواڑہ، منڈلا اور چاندا میں گونڈ ریاستیں سر اُٹھا چکی تھیں۔ بعد ازاں دو تین صدیوں تک وسطِ ہند کے کوہستانوں پر گونڈ راجاؤں کی حکومت رہی اور یہ علاقہ آج بھی گونڈوانہ کہلاتا ہے۔ گونڈ راجے اپنی پرجا پر ظلم نہیں ڈھاتے تھے۔ بُردباری اُن کے قانون کا مُول منتر تھا۔ اُنہوں نے قلعے بنوائے، تالاب اور کنوئیں کھدوائے۔ تب لکشمی جہاں تھی راجہ اور پرجا پر برابر برابر۔ کہا جاتا ہے کہ چوڑا گڑھ کے قلعے میں سونے کی مہروں سے بھری ہوئی پوری ایک سو بڑی بڑی گاگریں اکبر کی فوج کے ہاتھ لگی تھیں۔ چاندا کے راجے اور بھی دھنی تھے۔ ان کے ہاں مقبرے تھے۔ محل بھی اور جھیلیں بھی۔ انہیں اپنے شہر کے گرداگرد سات میل لمبی شہر پناہ بنوانے کا فخر حاصل تھا۔ جنتا کے پاس

کبھی مال مویشی کا ٹوٹا نہ رہتا تھا اور گونڈ کسان اپنا مالیہ مہروں کے روپ میں چکایا کرتے تھے لیکن گونڈ جنگجو نہ تھے۔ اٹھارہویں صدی میں گونڈ راجے کسی خاص مزاحمت کے بغیر ہی مرہٹہ سرداروں سے ہار کھاتے چلے گئے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گونڈوں کو بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں کی پناہ لینی پڑی۔ انیسویں صدی نے انہیں کسی حد تک لٹیروں کا روپ دھارن کرتے دیکھا۔ کاروانوں پر ہاتھ صاف کرنا اور پڑوس کے قصبوں پر ٹوٹ پڑنا یہ ان کا شغل بنتا گیا۔ لیکن بہت جا۔ انگریزی عملداری میں گونڈ جنتا، جو امن کو اپنا سب سے بڑا آدرش سمجھتی تھی، آرام سے دھرتی سے لو لگا بیٹھی۔ میدانی علاقوں سے بنئے آئے اور ہوشیار کلال آئے اور یہ دیمک کے کیڑے گونڈوں کی کمائی کو اب روز روز اس قدر ختم کرتے رہتے ہیں کہ انہیں بے حساب محنت کے باوجود پیٹ بھر روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ اور قرضہ الگ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

گونڈ لوک گیت، گونڈوں کی غریبی کے ترجمان ہیں۔ ان کے لوک ناچ، جو سارے قبیلے کی خوشی کے گرد گھوما کرتے تھے، اب مغموم نغموں کے جنم داتا بن چکے ہیں۔

”ہٹی ہر“ کے بازار میں گڑ نہیں ملتا!

”کرما“ ناچ میں گانے والوں کا سُر نہیں ملتا۔

اور گونڈوں کی بنسری سے بھی غمناک نغمہ پھوٹتا ہے۔ لمبا، سُونا دن گزرنے ہی میں نہیں آتا اور زندگی سرے سے بے کیف نظر آتی ہے، تو خود بخود

گانے والے کے آنسو اس کے گیت کو بھگو کر رکھ دیتے ہیں۔

درختوں کے درمیان مَیں بنسری بجاتا ہوں۔

لیکن کون پرواہ کرتا ہے اس غریب بن باسی کی؟

نہ میری ماں ہے نہ بھائی، نہ کوئی یار دوست دُنیا بھر میں۔
دن بھر میں بنسری بجاتا ہوں۔
درختوں کے درمیان مَیں بنسری بجاتا ہوں۔
میری ایک ماں ہے بھائی بھی اور کچھ یار دوست بھی جو میرے ساتھ کھانے پینے میں شریک ہیں پر اُن میں سے ایک بھی اس غریب بن باسی کی مدد نہیں کرتا۔
ایک بیل کی چھاؤں میں کوئی بیٹھا ہے۔
اُسے بچھّو کاٹتا ہے اور وہ روتا ہے۔
کون پروا کرتا ہے بن باسیوں کی؟
درختوں کے درمیان مَیں بنسری بجاتا ہوں۔
منڈلا کے ضلع کے گونڈوں نے الگ اپنا گیت تیار کیا ہے جسے وہ اپنا "کرما" ناچتے ہوئے بلند آواز سے گاتے ہیں:
گائے بیچ کر میں نے جنگل میں مویشی چرانے کا محصُول ادا کیا۔
بیل بیچ کر میں نے اپنا مالیہ چُکایا
اتنے سے بھی پورا قرضہ نہیں اُترا، جی گھبراتا ہے، میری محبوبہ!
اس منڈلا ضلع میں زندگی کٹھن ہو گئی ہے!
مَیں نے تھالی بیچ ڈالی، لوٹا بیچ ڈالا۔
اور گلے کا ہار بیچ ڈالا
اتنے سے بھی پورا قرضہ نہیں اُترا، جی گھبراتا ہے، میرے محبوب!
اس منڈلا ضلع میں زندگی کٹھن ہو گئی ہے!

ایک اور گیت میں کوئی گونڈ کسان اپنا رونا روتا ہے۔ شاید یہ نغمہ جنتا کے دیپک راگ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے سُر سُر نہیں شعلے ہیں جو گانے اور سُننے والوں کو بھسم کر دینے کا حکم رکھتے ہیں:

ہائے کیسے بھروں گا اس سال اپنے بچوں کے پیٹ؟
فصل دھوکہ دے گئی۔
لگان تو چکا ہی سکتا ہوں ہل بیچ کر، بیل بیچ کر
لیکن کیسے بھروں گا اس سال اپنے بچوں کے پیٹ؟

معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں غم زیادہ ہے اور خوشی کم، بہت کم۔ اسی لیے کبھی کبھی امیر زمیندار بھی بُری طرح غریبی کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایک "دادریہ" گیت میں یوں چٹکی لی گئی ہے:

ہمارے گاؤں کا زمیندار بہت غریب ہو گیا ہے۔
اُس نے اپنی بہن کو بیچ دیا ہے اور ایک دھوتی خرید لی ہے۔

"کرما" ناچ میں ڈھول والے زور زور سے ڈھول بجاتے ہیں۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ غم کی خلیج پر خوشی کا پُل باندھنا آسان نہیں۔ چنانچہ اُن کی حیرانی کی کوئی حد نہیں رہتی جب ایک بار پھر وہی غم کی کہانی نغمہ میں داخل ہو جاتی ہے:

خوشحال آدمی خوشی کا نغمہ گاتا ہے
مگر غمگین آدمی غم کے سُر چھیڑتا ہے۔
کیسے بتا سکتا ہوں میں اپنی زندگی کے غم؟
انہیں تو صرف خدا ہی گن سکتا ہے۔

گھر سے آتی ہوئی آوازیں سُن کر تم معلوم کر سکتے ہو
کہ وہاں کوئی غم ہے یا خوشی۔

اور پھر شیروں کا ڈر۔ شیر اور چیتے یوں نظر آئیں نہ آئیں، تنگ درے سے بہنے والی ندی کے کنارے کیچڑ پر اُن کے پاؤں کے نشان نظر آجاتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ زندگی ایک مسلسل ڈر ہے جس سے موت ہی نجات دلائے تو دلائے:

شیروں سے بھرپور ہے یہ جنگل، ہم کیسے بچیں گے؟
وہ ایک شیر سے ملتا ہے اور کہتا ہے ——
یہی لکھا ہے میری قسمت کی پوتھی میں
کہ میں مارا جاؤں!
شیروں سے بھرپور ہے یہ جنگل، ہم کیسے بچیں گے؟
تنگ پہاڑی درے ہیں ——
درے ہیں جہاں کیچڑ کی بھرمار ہے،
شیروں کے نقش پا دکھائی دیتے ہیں۔
شیروں سے بھرپور ہے یہ جنگل، ہم کیسے بچیں گے؟

دُنیا میں شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غلامی جاری رہے گی۔ گھرانہ اس کے گرد و پیش کا منظر دیکھتے ہوئے جھٹ گونڈ شاعر کو راجہ کا دھیان آتا ہے:

بانس کو جھکنا ہوتا ہے، بانس کی چھڑی کو جھکنا ہوتا ہے، تبر
کمان کو جھکنا ہوتا ہے رے،

اور راجہ سارے سنسار کو جھکا رہا ہے

ہائے رے ہائے، راجہ سارے سنسار کو جھکا رہا ہے۔

راجہ کا ذِکر بار بار آتا ہے۔ درختوں کے پتّے سُوکھ کر گِر جاتے ہیں اور کبھی کبھی اِنہیں آگ لگ جاتی ہے:

اِس جنگل میں، اُس جنگل میں پتّے جل رہے ہیں

ارے پتّے جل رہے ہیں

یہ خبر سُن سُن کر راجہ اَنکتا ہے اور ہمارا کلیجہ جلنے لگتا ہے رے!

گونڈوں کے "دادریہ" گیت اُن کے مختصر گیت ہیں جو جاپان کے "ہاکو" گیتوں کے بھائی بند معلوم ہوتے ہیں۔ بس ایک ہی بیت میں تصویر کھینچ کر رکھ دی جاتی ہے یا حسب ضرورت اس کی دونوں سطروں میں سے ایک سطر کچھ ہی لفظوں کے شیریں اُلٹ پھیر کی مدد سے تیسری سطر کے رُوپ میں گائی جاتی ہے۔ دادریہ، خاص جنگل کی چیز ہے اور کبھی کبھی اسے "بن بھجن" یا "جنگل کا نغمہ" کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لکڑہارے لکڑی کاٹتے ہوئے دادریہ گاتے ملیں گے۔ بہت سے دادریہ سوال جواب کے رُوپ میں گائے جاتے ہیں۔ محبّت کے ننھّے نغمے، جنہیں لڑکے اور لڑکیاں دریا یا جھیل کے الگ الگ کناروں پر کھڑے ہو کر بھی گاتے ہیں۔ ان میں گونڈ شاعری کی بہت بڑی دولت پنہاں ہے، ہمیشہ ایک مختصر سا تصوّر، ایک نہایت محیط جذبہ دادریہ کو جنم دیتا ہے۔ ہر دادریہ راگ کا رہینِ منّت ہوتا ہے اور چونکہ دادریہ ایک سے زیادہ طرز سے گایا جاتا ہے، اس کا وزن ہمیشہ کسی ایک اصُول پر مبنی نہیں

ہوتا۔ کچھ نمونے ملاحظہ ہوں :-

۱

باہر مینہ برستا ہے
گھر کے اندر ایک لڑکی بیٹھی رو رہی ہے

۲

جی چاہتا ہے توے پر روٹی سینکا کروں
تجھے سامنے بٹھا کر تیرا مُنہ دیکھا کروں

۳

توے پر روٹی میں نے جلا ڈالی
بالم! ایک ہی بول سے تم نے مجھے لہرا دیا

۴

کھالے، پی لے، اور آنند کرلے
مجھے یاد نہ کرنا نہیں تو سِسک سِسک کر مر جاؤ گے

۵

تل کا تیل یوں ہی بل میں ڈال دیا
رو رو کر میں نے حال سنایا لیکن میری بات کو وہ دِل میں نہیں دھرتا

۶

بیر پک گیا۔ اِسے کیسے ہلاؤں
پرائے آنگن میں کھڑے ہو تمہیں کیسے بلاؤں؟

۷

توے کی روٹی توے ہی پر مل جاتی ہے
بھگوان کرے میرا باسی بھات کھانے والا بھوکا ہی مر جائے۔

۸

پورنماشی کے چاند کو چڑھتے ہوئے نہ دیکھ پائی
دیکھنے میں وہ پیارا لگتا ہے اور چھونے میں ٹھنڈا

۹

گیہوں کی روٹی پر چٹنی ہے
تیرے گورے بدن پر میری آس لگی ہے
تیرے گورے بدن پر، او سکھی!

۱۰

حقا تو ٹپکتا ہے، ٹپک کر پڑا رہتا ہے
اپنی ٹوپی میرے سرہانے رکھ جا تاکہ تیرا بھروسہ رہے۔

۱۱

ڈنڈا مار مار کر 'تومبل' کے پیٹ سے پھل گرا رہی ہے
کمر تک لمبے ہیں تیرے بال، اتنا تیل تو کہاں سے لے گی؟

۱۲

چاند اور سورج بھائی بھائی ہیں
او البیلے یار، تم نے میری بانہیں کیوں کھینچیں؟

۱۳

املی کے پانچ درخت ہیں، جامن کے چھتیس

چھتری تان دے، میرے دوست، میرے منہ پر دھوپ پڑ رہی ہے

چھتری تان دے، میرے دوست!

۱۴

بیر کھا کر میں نے گٹھلی پھینک دی

تو کب کا گویا ہے چھیلا، تو ہمیشہ میرے جھوٹے گیت گایا کرتا ہے،

تو کب کا گویا ہے، میرے دوست!

۱۵

پیپل کے پتے جھڑنے لگے

ہمارے ساتھیوں کے جھنڈ: اری کنیا، اب آگے کو چلنے لگے

۱۶

میں جنگل میں گئی اور میں نے زہر تلاش کیا

میں دادریہ گاتی ہوں، اپنے بائیں کان سے اسے سن لو میرے دوست!

۱۷

املی کے پتوں پر تمہاری قسمت لکھی ہوئی ہے۔

ہائے ہائے تم روتی ہو، کیونکہ تمہارا محبوب تمہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔

۱۸

کچنار لانے کے لئے میں جنگل کو گیا

دھیرے دھیرے ناچ، او کنیا! نہیں تو ڈھولئے تجھے اُٹھا لے جائیں گے

۱۹

اُونچی اٹاری ہے اور اُونچی ہے کھڑکی
نین تو لگا لے گورا، او دوست، میں راجہ کی لڑکی ہوں۔

۲۰

"ساج" کے درخت کا ساگوان کے ساتھ بیاہ ہو گیا
"تیندُو" کا پیڑ کنوارا رہ گیا، او رانی، اب کے سال!

یاد رہے کہ گونڈ شاعری میں ساج کے درخت کو عورت کے رُوپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ ساگوان ہمیشہ مرد کا ہم معنی ہوتا ہے۔ "تیندو" بھی مرد ہے۔ اور اُس کی شادی "چار" یا چرونجی کے پیڑ سے ہونے کا تصوّر باندھا جاتا ہے "چار" سے تشبیہ دی جانے پر کوئی بھی گونڈ کنیا خوشی سے پھُولی نہیں سماتی۔

لاکھ بھیانک سہی جنگل ہر گونڈ کی نگاہ میں "مدھوبن" ہے جہاں پہلی بار محبّت جنم لیتی ہے اور جنگل کا ہر راستہ ہجر کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

"کرما" اور "دادریہ" کے علاوہ گونڈ لوک گیتوں کی اور بھی بہت سی قسمیں ہیں۔ کئی طرح کے ناچ ناچے جاتے ہیں۔ ہر ناچ کے اپنے الگ گیت ہوتے ہیں، جو ناچ کے نام سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ محض "دادریہ" ہی وہ گیت ہے جو ناچ کے بندھن سے آزاد ہو کر گایا جاتا ہے۔

آخر میں ایک کرما گیت اور ملاحظہ ہو۔ اصل گیت چھتیس گڑھی میں ہے، جو ہندی کی ایک مشہور بولی ہے:-

"ڈھیمبر کے گھر بالک بھئے ہیں
دھریں اُسیساں جال ہو
سنگنی مچھریا ہو دُھر دُھر رووے مایاں
پیدا بھئین جیو کے کالے ہائے رے!
ہائے رے ہائے، پیدا بھئین جیو کے کالے ہائے رے!"
— "ماہی گیر کے گھر ایک بیٹے نے جنم لیا ہے —
سر پر جال رکھے ہوئے
"سنگنی" مچھلی "زار زار" رو رہی ہے —
میری جان کا ایک دشمن پیدا ہو گیا ہائے رے
ہائے رے ہائے، میری جان کا ایک دشمن پیدا ہو گیا!"

ڈگال نے ٹھیک سا ہی تو کہا تھا: ہر گونڈ من ہی من میں سنگنی مچھلی کی طرح رویا کرتا ہے کیونکہ اُس کے لئے اور کسی نہ کسی ماہی گیر کے ہاں ایک بیٹا جنم رلیا کرتا ہے — سر پر جال رکھے ہوئے۔"

"کرما" ناچ بہار کے آغاز میں ہری ہری ٹہنیاں گاؤں میں لانے کی علامت کے طور پر ناچا جاتا ہے۔ یہ بھی رواج ہے کہ ایک درخت کا کچھ حصّہ کاٹ کر اسے گاؤں کے کسی چوراہے پر گاڑ دیا جائے اور پھر اس کے گرد مرد اور عورتیں بل کھا کھا کر ماناچتے ہیں۔ یُوں یہ ناچ کسی بھی موسم میں ناچا جا سکتا ہے ہمیشہ اس کے نغموں میں اندی جنگل کے درخت سانس لیتے محسُوس کئے جا سکتے ہیں۔ ڈھول لئے ہمیشہ مرد ہوتے ہیں جو دائرے کے مرکز میں کھڑے رہتے ہیں۔

ایک ساتھ کئی کئی ڈھو لئے ڈھول بجائیں تب کہیں کرما کا تال گونڈوں کی رُوح میں اُتر سکتا ہے۔ عورتوں کی ایک قطار ڈھولیوں کے رُوبرُو ناچتی ہے یا عورتیں ڈھولیوں کے گرد حلقہ بنا کر ناچتی ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس حلقہ کے بہت وسیع ہو جانے کی صُورت میں کچھ کنواریاں ذرا ہٹ کر اپنا حلقہ الگ بنا لیں اور بڑے حلقے سے بالکل مخالف ہو کر ناچ شروع کر دیں۔ مطلب یہ کہ اگر عورتوں کا حلقہ دائیں سے بائیں جانب حرکت کر رہا ہو تو کنواریوں کا حلقہ بائیں سے دائیں جانب حرکت شروع کر دے گا۔ اپنے جسم کے تمام اعضاء کو اور خاص طور پر ہاتھ پاؤں اور کمر کو نہایت لطیف طور پر لچکا سکنے والی لڑکی بہترین ناچنے والی سمجھی جاتی ہے۔ گیت کی ابتدا کبھی مردوں کی طرف سے ہوتی ہے اور کبھی عورتوں کی طرف سے۔ مرد پہلے نغمہ شروع کریں تو عورتیں اسے اپنے سروں کے ہمراہ آگے بڑھنے میں مدد دیتی ہیں۔ یا وہ مردوں کے گیت کا جواب دینے کے لئے خود کو تیار رکھتی ہیں۔ مرد اور عورتیں چلتے پھرتے درختوں کی طرح اپنا کرما رات رات بھر ناچتے ہیں ——— گونڈوں کے جنگل میں۔

منی پور کی وادی میں

ڈیمپا پور سے امپھال تک ایک سو چونتیس میل کا سفر بہت دلچسپ رہا۔ ناگا پہاڑیوں میں ناگا لوگ دیکھنے کو ملے۔ نئی تہذیب کے چہرے پر غازے کی چمک بہت دیکھی تھی، کئی کئی صدیاں پہلے کی سادہ، بے تکلف اور نکھری ہوئی زندگی کو اپنائے رکھنے والی قدیم النسل تو میں بھی کئی بار میرے الوٹ سفر کو چھو چھو گئی تھیں۔ لیکن ناگا لوگوں کو دیکھے بغیر میرا ذہنی اُفق کتنا بے رنگ رہتا، یہ محسوس ہوتے دیر نہ لگی۔ لاری کے سکھ ڈرائیور نے بتایا کہ ناگا لوگوں کے قومی ناچ ان کی جنگی روایتوں کے حامل ہیں۔ وقت اُڑا جاتا تھا اور تہذیب لمبی چھلانگیں لگانے پر مجبور تھی۔ لیکن ناگا لوگ بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ کوئی ایسی تحریک شروع ہونی چاہیے، میں نے سوچا، کہ قدیم النسل قوموں کو وقت کے ساتھ ساتھ اُڑنے کا دھیان دلایا جائے تاکہ وہ بھی زندہ ہندوستان کی برابر کی حصہ دار بن سکیں۔ رنگ

دھڑنگ رہنے پر کیوں مجبور رہوں؟ ان کی نشو و نما کے بغیر ہماری نشو و نما نہ صرف ادھوری ہے بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے، اور پھر یکایک میرا ذہن مستقبل کی طرف گھوم گیا۔ جب ہندوستانی فوج میں ناگا لوگ اپنی روایات کو معنی خیز بنا سکیں گے۔

لاری ڈرائیور کہہ رہا تھا "یہ سڑک مجھ سے آشنا ہے۔ اپنے وطن پنجاب سے بہت دُور مَیں نے اپنی جوانی کی بہاریں خوش ہو کر اُدھر ہی گزار دیں۔ مَیں واپس نہ جاؤں گا۔ اب یہ سڑک مجھے چھوڑے گی نہیں۔ اچھا ہو اگر آپ بھی ادھر ہی کے ہو کر رہ جائیں ادھر ہی کے۔" اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے میں نے اس کی شرابی آنکھوں میں منی پور کی وادی کا رنگین اور خمار آگیں منظر دیکھ لیا تھا۔

ناگا لڑکیوں کا بے لاگ حُسن جو غازے کی جھوٹی چاپلوسی سے بے نیاز تھا اکثر اُسے برماتا رہتا۔ منی پوری دوشیزاؤں کے خدوخال الگ کشش رکھتے تھے، اور ابھی تک وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا "نت نت من ڈول ڈول جاتا ہے۔" وُہ کہہ رہا تھا "آپ ہی بتائیے بغیر شراب پیئے مَیں لاری نہیں چلا سکتا۔ کہیں ایک جگہ من ٹک جائے، کسی منی پوری یا ناگا لڑکی سے بیاہ کر کے اس کی آنکھوں میں اپنے سپنوں کو پہچانتا چلا جاؤں تو شاید کمبخت شراب کی کچھ ضرورت نہ رہ جائے۔" آسام میں دو تین بار کچھ منی پوری لڑکیوں سے میرا تعارف ہو چکا تھا اور اب راستے میں جھٹ سے ناگا دوشیزاؤں کے جھرمٹ آنکھوں کے آگے سے نکل جاتے تھے۔

مَیں نے کہا "سردار جی! من تو کام ہی ہے ڈول ڈول جانا۔ تمہاری جگہ مَیں ہوتا تو ضرور کسی ناگا لڑکی کے ہاتھوں میں اپنا جیون سونپ دیتا۔ کیونکہ میری تو یہی رائے ہے کہ ہماری قومی نشو و نما ہمیشہ سے خون کے خلط ملط ہونے کی مرہونِ منت

رہی ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ مجھ میں صرف پراچین آریا قوم کا خون دوڑ رہا ہے تو اس کا کیا ثبوت؟ پے در پے ہمارے وطن میں نہ جانے کتنی قومیں آئیں۔ ہر بار نہ صرف میدانِ جنگ میں دوست اور دشمن کا خون ایک ساتھ بہنے لگتا تھا بلکہ امن پسند اور رُوحانی وقفوں میں حملہ آور قوم کے سپاہی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کسی نہ کسی لڑکی یا عورت کو اپنی محبت کا ثبوت دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ میں خود اپنی رگوں میں کئی کئی قوموں کا خون دوڑتا محسوس کرتا ہوں۔ ہاں تو کسی ناگا لڑکی سے بیاہ کرنے کا مطلب ہوگا خون کی ایک اہم آمیزش۔

لاری بھاگی جاتی تھی۔ ڈرائیور کی آنکھیں اور بھی شرابی ہو اُٹھی تھیں۔ قدیم منی پور کی راجکماری چترانگدا کی کہانی اُسے یاد تھی۔ مہابھارت کے رن بانکے تیر انداز ارجن سے وُہ کسی طرح کم نہ تھا جسے اپنی جنم بھومی کے ایک گھنے جنگل میں تپسیا کرتے دیکھ کر چترانگدا پہلی ہی نگاہ میں اپنا دِل دے بیٹھی تھی۔ ارجن مانتا نہ تھا اور چترانگدا نے کہا تھا "عورت کی عظمت کو مت ٹھکراؤ۔ اور دیس کے سُورما تمہارے جیسے ایک اور ارجن کو جنم دے کر تمہاری بھینٹ کر سکنا میری ہی شکتی کا کام ہے"۔ فرق صرف اتنا ہی تھا کہ یہ ارجن اب کسی منی پوری چترانگدا کی بجائے ایک ناگا چترانگدا کا منتظر تھا۔

باتوں باتوں میں کافی منزل کٹ گئی۔ ناگا پہاڑیوں کے اختتام پر منی پور کی وادی یوں نظر آتی تھی جیسے کسی نے نقشہ پھیلا رکھا ہو۔ ڈرائیور کہہ رہا تھا "بیس میل اور سمجھئے۔ پھر ہم امپھال پہنچ جائیں گے"۔

لے دے کر ساری ریاست میں ایک امپھال ہی تو ایک شہر ہے کوئی پندرہ

مربع میل کا رقبہ ہوگا، چودہ سَو کے قریب دیہات ہیں --- پانچ سَو وادی میں اور کوئی نو سَو پہاڑیوں میں - امپھال کے قریب دو دریا بہتے ہیں --- کھوبل اور اِمپھال جس سے راجدھانی نے اپنا نام حاصل کیا -

"اِمپھال کو ریاست کی تاریخ خوب یاد ہوگی، سردارجی" میں نے کہا "لہو سے رنگی ہوئی لال لال تاریخ - نہ جانے کتنی بار یہاں برمی حملہ آور آئے اور قتلِ عام شروع ہو گیا اور نہ جانے کتنی بار منی پوری سپاہیوں نے برما سے اِنتقام لیتے لیتے اپنی جانیں گنوائیں - اس کے علاوہ تخت کی خاطر کئی بار بیٹے نے باپ کے لہو سے ہاتھ رنگ لئے، کئی بار بھائی نے بھائی کو مار ڈالا اور وہ بھی نہایت دغا بازی سے"

ڈرائیور کا نشہ اتر چکا تھا - بولا "ضرور یاد ہوگی اِمپھال کو منی پور کی لال لال تاریخ - لیکن اب تو امن کا زمانہ ہے - پولیٹیکل ایجنٹ کا حکم سب کو منظور ہے"

منی پور کی تیس میل لمبی اور بیس میل چوڑی وادی اپنے چہرے سے لہو کے داغ ابھی تک دُور نہ کر سکی تھی - تاریخ کو اپنے خونی اَوراق دُہرانے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی - مَیں نے سوچا - یہ تو امن کا زمانہ ہے، یہاں کی معتدل اور خوشگوار آب و ہوا جو سال بھر یکساں رہتی ہے، کسی طرح کے خونی غسل کی تاب نہیں لا سکتی - جنم جنم کا حسن یہاں زندہ تھا - جنم جنم کا عشق بھی - اور حسن و عشق کی یہ وادی اپنے ذہن میں بسے ہوئے لوک گیتوں سے مجھے بار بار گدگدانے لگتی - لیکن یہ بھی سچ تھا کہ پُرانی تاریخ کی خُونی جھانکیاں میرے سپنوں کو جھنجھوڑ جاتی تھیں -

کھمبا اور تھوئی بی کا افسانہ محبت منی پوری لوک گیت کی اہم جاگیر ہے - گشتی گویئے کے مُنہ سے اسے سُنتے سُنتے ہر کسی کی آنکھیں نمناک ہو اٹھتی ہیں -

اپنے ایکتارے پر، جسے منی پوری زبان میں "پینا" کہتے ہیں اور جس میں لوہے یا پیتل کا تار نہیں بلکہ گھوڑے کا بال لگا یا جاتا ہے، وہ اپنے سُر چھیڑتا ہے، اور دھیرے دھیرے، گیت کے شدید لیکن پائیدار الفاظ سُننے والوں کے دل کے پاتال تک اُترے چلے جاتے ہیں۔ یہ کئی صدیاں پہلے کا قصّہ ہے۔ تھوئی بی ایک شہزادی تھی۔ کھمبا غریب تھا لیکن نہایت خوش وضع نوجوان تھا۔ تھوئی بی خود بھی ایک بے مثل حسینہ تھی۔ اسے ایک جھیل میں کشتی پر سیر کرتے دیکھ کر کھمبا پہلی ہی نگاہ میں اسے دِل دے بیٹھا لیکن ہمیشہ کی طرح عشق کی راہ یہاں بھی کٹھن ہو اُٹھی۔ "کونگ نیک با" نامی ایک کوئی اَور شخص کھمبا سے حسد کرنے لگا۔ اور اُس نے خود تھوئی بی کو بھگا لے جانے کی کوشش میں کھمبا کو بڑی بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنے پر مجبور کر دیا۔ کھمبا ہر آزمائش میں پُورا اُترا اور آخر تھوئی بی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تھوئی بی کو بھی کئی کئی مصیبتوں سے گزرنا پڑا۔ یہ قصّہ المناک ہے کھمبا کو اپنی محبوبہ کی وفاداری پر شک ہو گیا۔ اور تھوئی بی نے خودکشی کر لی۔ لیکن شاید ہر منی پوری سوچتا ہے کہ تھوئی بی تو اب تک زندہ ہے۔ اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔

منی پوری لوک گیت سادگی اور خلوص کے امانت دار ہیں اور ان کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ ان کی کیفیت عالمگیر ہے۔ پہلے تین لوریاں ملاحظہ ہوں:

ا

سو جا، سو جا، ننھے سو جا
کٹوری میں دُودھ بھرا ہے

پی لے، پی لے، ننھے پی لے
سوجا، سوجا، ننھے سوجا

۲

رو مت ننھے، رو مت
سنہری بچھونے پر سوجا
رو مت ننھے، رو مت

۳

چاندی کی کھاٹ ہے، ریشم کا بچھونا ہے
مورنی جیسی بہن، اس کھاٹ پر سوئی پڑی ہے ——
وہ اچھی طرح آرام میں مگن ہے

اور پھر عشقیہ گیتوں کے ریشمی تار دیکھتے جائیے۔ ان کو منی پور کی رنت رنت کی زندگی سے گہری نسبت ہے۔ ورڈزورتھ نے کہیں ٹھیک لکھا ہے "گاؤں کی سادہ زندگی میں دل کے لطیف جذبوں کو بے روک جنم لینے اور نشوونما پانے کا موقعہ ملتا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ ان کی ترجمانی کے لئے ایسی سادہ زبان ملتی ہے جو زندگی کے تمام درجوں کو اُن کی اصلی صُورت میں بیان کرنے پر فطری طور سے قادر ہوتی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خیالات اور جذبات میں تصنّع بالکل نہیں ہوتا۔ دل کی بات زبان سے اپنے صحیح انداز اور لوچ کے ساتھ ادا ہوتی ہے ....."
یہ بے وجہ چھلک جانے والے ننھے منی پور کی وادی میں ہمیشہ گونجتے رہتے ہیں!

۴

مدن منی پھول، او مدن منی پھول!

سالم پہنوں تو تم بہت بڑے ہو —
نصف پہنوں تو تم بہت چھوٹے ہو
ارے پھول تیرا پریتم باغ کا مالی ہے
ڈھنگ سے کھل جا!

۵

جنگلی پرندہ اُڑ گیا
گاؤں کا پرندہ اُداس ہوا تھا
جنگلی پرندے کا گھونسلا اُسے معلوم نہیں —
گاؤں کا پرندہ پاگل ہو اُٹھا
او میری محبوبہ! پہاڑ کی سنہری غار سے نکل کر اُڑتی ہوئی یہاں آجا۔

۶

او میری محبوبہ، آؤ آؤ
تیرے دشمن بہت ہیں، تیرے دوست بہت ہیں —
میرے آگے آگے چلو، آؤ
ناز و ادا سے ناچو، آنکھ کھول کر تجھے دیکھوں گا، راجکماری!
سامنے کی لُئی کائے "لبتی" میں کنول کھِلا ہے
شہد کی پہاڑی سانولی مکھی اس کی سگندھ پر اُڑتی ہے
مَیں پھل کی گٹھلی نہیں کھاتا، کھانے کے لائق حصّہ ہی کھاؤں گا۔

۷

اری بارش! "لنگ پہاڑی" سے نیچے اُچھل پڑ
تاکہ "پاسوئی" گاؤں کے نوجوان تروتازہ ہو جائیں
بُوڑھے اور بوڑھیائیں دُور بہہ جائیں ——
ان کی جگہ بچوں کا جنم لینا قدرتی امر ہے۔

۸

او میری محبُوبہ، تیرا پریتم تیرے لئے بجھا ہُوا سا ہے
دل اب درد کو برداشت نہیں کر سکتا
قسمت کی آگ سے جلتے ہوئے آنسُو
ہتھیلیوں کو جلائے دیتے ہیں
جنگل کے جلتے ہوئے پیڑوں پر پانی گرا سکتا ہوں
دل کی آگ بجھانے کے لئے کیا کروں؟

۹

پہاڑ پر خودرَو پھُول کھِلا ہے
کان میں پہنے بغیر ہی تم گر گئے افسوس ہے
"اپنی مرضی سے نہیں گرا، ہوا کے جھونکے سے گر گیا ہوں"
"ہوا اپنے لئے کچھ نہیں کرتی
غنچے کی ڈنڈی بہت نازک تھی کہ گِر گئی!"

۱۰

پھول کی کھلتی ہوئی کلی کی طرح مسکراتی ہوئی کنواری
بہت بہت سندر ہے
نہ ایسی کنواری کبھی دیکھی گئی، نہ خیال میں لائی گئی، نہ تلاش کی گئی
آج وہ گم ہو گئی یونہی!
شاعر بھی یہ بھید نہیں جانتا ———
کہ اچھی لڑکیاں جنم ہی سے کتنی سندر ہوتی ہیں۔

اب ایک جنگی گیت سنئے جو شکار کے موقعہ پر بھی گایا جاتا ہے، اسے سنتے سنتے ایک سپاہی اور شکاری کا خون گرم ہو اٹھتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ نغمہ ساز کی نئے جوان گنت صدیوں سے اپنی تمام تر جدت کے بل پر زندہ ہے گیت کے الفاظ میں ایک نیا ہی جادو بھر دیتی ہے:

۱۱

جنگ شروع ہو گئی،
دشمن مضبوط ہے،
جنگ شروع ہو گئی،
مضبوط ہو جاؤ
شیر کا چمڑا تن گیا
سانبھر کی آنکھیں پوری پوری کھل گئیں
جنگلی بلی کا چمڑا تن گیا

جنگلی بلّی کی آنکھیں پوری پوری کھل گئیں
سر کاٹ لیا گیا۔ سر کاٹ لیا گیا
جنگی گیت چھیڑ دو
سر کاٹنا اچھا کام ہے ——

اور اب اخیر میں ایک جدید گیت ملاحظہ ہو جس میں کسی تعلیم یافتہ منی پوری شاعر نے اپنی حب الوطنی کا نغمہ چھیڑ کر منی پوری لوک گیت کو نئی آواز دے دی ہے منی پور کو مخاطب کرتے ہوئے وہ کہتا ہے :۔

۱۲

تم سب کنول سے بھرپور ہو
تم لاکھوں سنگاروں سے سجے سنگارے ہو
تم ماتا سمان ہو، پتا سمان ہو
چنتا اور بپتا سہتے ہوئے بھی
تمہارا دل ماتا سمان ہے ——
تمہاری رکشا کے لئے
تمہارے لاکھوں بیٹے روشن مشعلیں لئے کھڑے ہیں
پر تم اپنا دُکھ تو پرگٹ نہیں کرتے
او منی پور، تم ہماری پوتر ماتا ہو، او منی پور

پولیٹیکل ایجنٹ سے لے کر سکھ ڈرائیور تک میرے کام میں ہر کسی کو یکساں

دلچسپی تھی۔ منی پوری لوک گیت کی تلاش میں مجھے ان گنت لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ کئی میلے دیکھے، کئی ہاٹ بازار دیکھے جن میں خاص امپھال کا روزانہ ہاٹ بازار مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ جدھر دیکھو عورت ہی عورت نظر آتی ہے۔ کوئی تین ہزار عورتیں ہر روز یہاں اپنی اپنی دستکاری یا کوئی اور پیداوار بیچنے کے لئے جمع ہوتی ہیں۔ اسے ہم منی پوری حسن کا میلہ بھی کہہ سکتے ہیں معلوم ہوتا ہے یہ حسین حسین چہرے خالق قدرت نے نہایت اطمینان سے فرصت کی گھڑیوں میں تعمیر کئے تھے، جیسے کہ منی پور کی بیٹیوں کی تیار شدہ ململ یا ریشمی کپڑے کو دیکھ کر جھٹ یہ دھیان آتا ہے کہ ہنرمندوں کی انگلیاں اندھی مشینوں کو چکما دے سکتی ہیں۔ کئی شادیاں دیکھیں، کئی ناچ دیکھے اور ہر کہیں گیتوں کے متعلق میری پوچھ گچھ جاری رہی۔

شمال میں ناگا پہاڑیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ جنوب میں لشائی پہاڑوں کی قطار تھی۔ مشرق میں برما کی سرحد ملتی تھی تو مغرب میں کاچھار کا علاقہ چلا گیا تھا۔ کوئی ساڑھے آٹھ ہزار میل کے گھیرے میں منی پوری جنتا رومان کو چھوڑتی چھوڑتی سی اور دھیرے دھیرے حقیقت کے قریب آتی دکھائی دیتی تھی۔ جمہور کے خیالات کسی نہ کسی طرح ان لوگوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔ تین لاکھ سے کچھ ہی کم آبادی میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہے۔ منی پوری عورت منی پوری مرد کے سامنے اپنی آزادی کو ذرا آنچ نہیں آنے دیتی۔ اور ظاہر ہے کہ جمہور کے خیالات اسی کے ہاتھوں پروان چڑھ رہے ہیں۔

منی پور کی وادی میں نئی زندگی جنم لے رہی تھی۔ پولیٹیکل ایجنٹ کو منی پوری زبان سے خاص دلچسپی تھی۔ "تعلیم بیکار نہیں جاتی" وہ کہہ رہا تھا "منی پوری ادب کا

مستقبل روشن ہے۔ شاعروں اور ادیبوں کی مدد میرے پروگرام میں شامل ہے۔"

واپسی پر اسی سکھ ڈرائیور کی لاری مل گئی۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے پھر وہی شرابی آنکھیں میرا دھیان کھینچ لیتیں۔ وہی رومانی باتیں۔ ابھی تک اسے کسی ناگاچترانگدا کا پیار نصیب نہ ہو سکا تھا۔ میں نے کہا، "دیکھو سردار جی، کم از کم لاری چلاتے وقت شراب پینے کی عادت چھوڑ دو۔ ورنہ ایک روز تم ضرور اپنے مسافروں سمیت موت کے منہ میں گر پڑو گے۔"

"تو اس کے لئے دوسری شراب چاہئے --- ناگاچترانگدا!"

ڈیما پور پہنچ کر میں نے سردار جی کو الوداع کہی، اس کا سارا رومان اس کی کھوئی کھوئی سی آنکھوں میں جمع ہو گیا تھا۔ میں نے کہا، "میرا ذہن پہلے سے بہت زرخیز ہو گیا، سردار جی اور پھر یہ تو تم جانتے ہو کہ زمین کو زرخیز بنانے میں دریاؤں کا بہت ہاتھ ہوتا ہے جو اونچے پہاڑوں سے سفید مٹی کاٹ کاٹ کر نیچے وادی و میدان تک لاتے رہتے ہیں، مجھے تو تم بھی ایک ایسے ہی دریا معلوم ہوتے ہو۔ ہاں تو میرا ذہن پہلے سے کہیں زرخیز ہو گیا --- منی پور کی وادی ہی کی طرح!" اور یکایک میرا ذہن مستقبل کی طرف گھوم گیا، جب ناگاچترانگدا سردار جی کے لئے ایک نئے ارجن کو جنم دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائے گی اور یہ ارجن یا تو منی پور جمہور کا صدر بن کر رہے گا یا پھر منی پوری جنتا کا ہر دل عزیز شاعر یا مغنی۔

سنتھالوں کی رنگ بھومی پر

سانولی سانولی سنتھالنیں شکل کی سانولی لڑکیاں ہی تو تھیں۔ لال لال، پیلی پیلی، دھانی دھانی، سپید سپید ساڑھیاں ساگر کی لہروں کو شرماتی نظر آتی تھیں۔ ہر سنتھال لڑکی بہاروں میں جھولتی چلی آتی تھی۔ لیکن یہ دھرتی خود اس سے نا آشنا تھی۔ رنگ، دلبری کے پیرہن، کیونکہ حسن کبھی کے ڈھل چکے تھے۔ بوڑھی عورت کی پیشانیوں پر وقت کا ہل گہری لکیریں چھوڑتا ہوا نکل گیا تھا۔ وقت نے کیسی شکنیں ڈالیں؟ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا شکوہ بھی کب تک؟ روز روز تو یہ میلہ نہ آتا تھا۔ برس میں ایک بار سنتھال جنتا اس رنگ بھومی پر جمع ہوتی تھی۔ سانولی لڑکیاں بہت خوش تھیں۔ یہ میلہ تو ضروری تھا۔

بچے، بوڑھے اور جوان سب تاش کے پتوں کی طرح خلط ملط تھے۔ عورتیں اور مرد گیت کے مختلف سروں کی طرح ہم آہنگ تھے۔ یہ بے پناہ ہجوم اپنی طاقت پر

بجا فخر کر سکتا تھا۔ منچلی سنتھال کنواریوں کے بازو، کسی لوک ناچ کے تال پر تھرکتے تھرکتے سے، خود بخود اوپر کو اُٹھ جاتے تھے۔ جیسے پرندے کسی لمبے سفر سے پیشتر تول رہے ہوں۔

کچھ کلچر کی تلچھٹیں بھی گھومتی پھرتی نظر آتی تھیں۔ اُنہوں نے اپنے پر سمیٹ رکھے تھے جیسے وہ اپنا سفر طے کر بیٹھی ہوں۔ یہ لڑکیاں شانتی نکیتن میں تعلیم پانے کے لئے دُور دُور سے آئی ہوئی تھیں۔ اُن کے خدوخال اپنے اپنے صوبے کی آب و ہوا کے مرہونِ منت تھے۔ قدیم النسل سنتھال تمدن کی طرف وہ گھورتی ہوئی نگاہ سے نہ دیکھتی تھیں۔ کسی کسی لڑکی نے اپنی سنتھال بہنوں کی طرح گلٹ کے آویزے پہن لئے تھے۔ یہ اس کا خراجِ تحسین تھا۔ تہذیب نے بہت سا سفر طے کر لیا تھا۔ مگر سنتھال تمدن چھکڑے کی چال کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا۔ قدیم وضع کے گلٹ کے آویزے کانوں میں، لونگوں اور منکوں کی مالائیں گلے میں، جُوڑے پر چاندی کی سُندر زنجیر یا کوئی جنگلی پھُول، آنکھوں میں بولتی بولتی سی کاجل کی لکیریں، بدن پر لہراتی لہراتی سی سیدھی سادی ساڑھی ——— یہ تھی سنتھال لڑکی کی تصویر اور اپنے ماحول میں ہر سنتھال دُلہن اپنی دھرتی کی رانی تھی۔ شانتی نکیتن کی کسی مہذب بیٹی کو دیکھ کر اس کے دِل میں احساس کمتری کا جذبہ پیدا ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ کیونکہ یہاں تو پڑھی لکھی بنگالی گجراتی اور مدراسی لڑکیاں خوشی خوشی اس کا قدیم سنگار اپنانے پر آمادہ ہو رہی تھیں۔

یہ شانتی نکیتن کا جنم دن تھا۔ لیکن "شانتی ہوش" یا سات پوس کا یہ میلہ شاید شانتی نکیتن کے جنم سے پیشتر بھی اسی طرح لگتا آیا تھا۔ شاعرِ ٹیگور جو سنتھال تمدن

کو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑے ہو کر دیکھنے کے حامی تھے، اِس تموّج کو محض تفریح کا سامان نہ سمجھتے تھے۔ سنتھال لوک گیت اور انہیں اپنی لہروں پر اٹھا لینے والے لوک ناچ نہایت خلوص سے ادا کئے جاتے تھے۔ بات بات میں موتی پرونے کے لئے شاعر کو جس طاقت کی ضرورت تھی اُس کی نشو ونما کے لئے یہ میلہ ترقی کا حکم رکھتا تھا۔

بوڑھی عورتیں اپنی بیٹیوں کی کنواری سندرتا کو اپنا اُترا ہوا قرض تصور کئے جاتی تھیں۔ کبھی بنسری کا مدہوش نغمہ کسی پازیب کی چھپتی چھپتی جھنکار ماضی و مستقبل کو جگاتی جگاتی کوئی نمکین مسکراہٹ ان کی آپ بیتی کی اُداس اُداس یادوں کو رنگین کئے جاتی تھی۔ کوئی بہکا بہکا ترانہ دیوالیہ حسرتوں کو پھر سے تازگی و شگفتگی بخشتا دکھائی دیتا تھا۔ کوئی نہ کوئی داخلی یا خارجی محرک میلے کی ہر لہر کو شاعر کی تخلیقی قوت کے قریب تر لے آتا تھا۔ اپنی ماؤں ہی کی طرح سنتھال لڑکیاں یہ محسوس کئے جاتی تھیں کہ زندگی سے اس میلے کو براہِ راست تعلق ہے۔ ہر ہر تماشائی اس تماشے کا نہایت اہم پرزہ تھا۔ بوڑھوں اور جوانوں میں جو خلیج حائل تھی اس پر حیاتِ نو کے خاموش و عمیق تاثرات نے ایک جھولتا پل تیار کر رکھا تھا۔

صبح سے شام ہوئی، شام سے رات .... عورتوں کے بازو کافور کی طرح چھوٹنے لگے۔ جیسے ان کافوروں میں شراب کی گاگریں رکھی ہوئی ہوں۔ ہر گاؤں کا اپنا اپنا گروہ تھا۔ ہر گروہ نے الگ اپنے ناچ کا اکھاڑہ جمایا تھا۔ ہو برابر اپنے گہرے تال کو اجاگر کئے جاتے تھے۔ بنسریاں الگ ان نغمہ و رقص کی محفلوں میں رنگ بھرتی جاتی تھیں۔ شراب صرف چڑھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ہر سنتھال تھوڑی بہت پی کر میلے میں آیا تھا۔ ناچ کے دوران میں بھی شراب کا

برابر انتظام تھا۔ یہ رتجگا، یہ ناچ، یہ عورتوں اور مردوں کی بے نظیر ہم آہنگی، ڈھول ہر ناچ کے رہنما تھے۔ روشن مشعلوں کی خاموش جھلملیوں میں ناچ منڈل کی سانولی پریوں کے دِل اُن کے تیل سے چپڑے ہوئے چہروں پر یوں تھرک اُٹھتے تھے، جیسے مفلسوں کے بوسیدہ لحافوں پر نئے پیوند دمک اُٹھیں۔ اور آسمان پر کہکشاں کا منظر پیشِ نظر تھا، شاید ستارے بھی اپنا ابدی ناچ ناچنے میں مگن تھے۔ تماشائی اوب جائیں تو اوب جائیں، خود سنتھال کیسے اوب سکتے تھے؛ لیکن سچ تو یہ تھا کہ سنتھالوں کے ہاں تماشائیوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ ہر گاؤں پورا کا پورا ناچتا آیا تھا۔ تماشائیوں کا سوال تو اِس رنگ بھومی پر پیدا ہُوا تھا، جہاں باہر سے آئے ہوئے لوگ کافی تعداد میں موجود تھے۔ کچھ شراب کا نشہ، جسے اُترنے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا تھا، کچھ ناچ کا نشہ، ڈھول اور بنسری بجانے والے اپنا فن خوب جانتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ رات لمبی ہوتی چلی جائے گی۔ اور یہ ناچ کے اکھاڑے ہر مرد اور عورت کے ذہن سے جنم جنم کا بوجھ ہلکا کر دیں گے ۔۔۔ وہ بوجھ جس کے پیشِ نظر خالص روحانی کا بہشت پیدا کرنا آسان نہ تھا۔

سنتھال گیت خلوصِ اظہار کے امانت دار معلوم ہوتے تھے۔ اپنی بے پناہ سادگی کے طفیل وہ کچھ ایسے مجسّمے کھڑے کر دیتے تھے جو رہتی دُنیا تک زندگی کا حق حاصل کر بیٹھے ہوں:

۱

بنسری نہ بجاؤ، بدن بالم،
ندی کے کنارے کنارے بنسری نہ بجاؤ

چٹان کے نیچے پانی سویا پڑا ہے، او بدن!
کاہے کو اسے پریشان کئے جاتے ہو؟
کاہے کو اسے سُنائے جاتے ہو؟

یہ ایک کنواری کا گیت تھا جس نے اپنے دِل کی اچھوتی محبت کو ندی کنارے کی چٹان تلے سوئے ہوئے پانی سے تشبیہ دے کر فضا میں ایک شدید لرزش پیدا کر دی تھی۔

۲

دھرتی میں کنواں ہے اور پاتال میں پانی
کاسی میں ڈوری بندھی ہے
کیسے گھڑا بھروں، کیسے اُٹھاؤں؟
پہلے جیسا نہیں رہا میرا بدن!

۳

گھر کے پچھواڑے کے باغیچے میں سُنبل کے پیڑ پر
"توت" پنچھی چہچہا اُٹھا۔
اور گاؤں کا چھوکرا کہہ اُٹھا
گرم ہواؤں والے دن گرمی کے آ گئے!

۴

گھر کے پچھواڑے کے باغیچے میں جھوا کے پیڑ پر
"بہو" پنچھی چہچہا اُٹھا
اور گاؤں کا چھوکرا بول اُٹھا ۔۔

برسات کے دِن آ گئے!

۵

"بڑے پہاڑ پر شکار کھیلنے جا رہے ہو تم سیٹی بجاتے بجاتے
میرے لئے لیتے آنا کیوڑا اور چمپا کے پھول"
"لا نے کو تو لا سکتا ہوں اور دینے کو دے بھی سکتا ہوں
پر کیسے تم اِن پھولوں کو پہنو گی۔ کیسے انہیں مرجھانے دو گی؟"
"میری سمجھ کو دیکھنا بالم، دیکھنا میری عقل
سر پر ہی ان پھولوں کو پہنوں گی اور سر پر ہی ان پھولوں کو مرجھانے دوں گی!"

۶

پہاڑ کو چھوڑ کر پنچھی گاؤں میں اُتر آیا
میرے آنگن میں پیڑ پر بیٹھ کر
خوشی خوشی نغمہ چھیڑ رہے پنچھی،
گیتوں کے دِن آ گئے!

۷

ہمارے دیس میں مہوا کے اَن گنت پیڑ ہیں
دوپہر کو اور سہ پہر کو مہوا کے پھول گرا کرتے ہیں۔
ہوا تیز ہے اور دھوپ بہت سخت
اتنی گرمی میں ہم مہوا نہ چننے جائیں گے، بالم!

۸

پُورب پچھم کے میگھ اُڈ آئے
اُتر دکھن کی بجلی چمک پڑی۔
پچھم میں دیکھو، بالم
اچانک بجلی چمک پڑی
بارش تو آ بھی گئی ظالم!

۹

او گاؤں کے نمبردار، او دیس کے حاکم!
دیس دیس میں تم انصاف کیا کرتے ہو۔
سچ سچ کہو، دھرم کی بات کہو۔
آکاش پر بھگوان ہے اُس سے ڈرو۔

۱۰

بڑے پہاڑ پر "جائے نگر" پھول کھل اُٹھا، او ماں!
"جائے نگر" لے کر میں کیا کروں گی، او ماں؟
میرا تو اپنا بدن ہی پھول کی مانند ہے۔

۱۱

تیل اور ہلدی رچا کر
چٹان پر بیٹھ کر
کاہے کو تم اُداس اُداس نظر آتی ہو، بیٹی؟
تم تو میرے جنم داتا ہو۔

روپیہ لے کر
سکھیوں کے بیچ سے
تم مجھے دُور بھگا رہے ہو، پتاجی!

۱۲

باپ نے کلسی خرید دی
ماں نے خرید دی تھالی اور باٹی
کلسی میں نے سر پر اُٹھائی، تھالی اور باٹی میں نے بغل میں دبالی
اُٹھتی جوانی میں میرے بدن پر پانی ٹپکتا ہے۔

۱۳

کہاں جنم لیا "دنگ" گیت نے؟
"ہہرڑی" میں "دنگ" گیت نے جنم لیا۔ "پُپرڑی" میں "دنگ" گیت نے جنم لیا
کہاں پرورش پائی "دنگ" گیت نے؟
"ہہرڑی" میں "دنگ" گیت نے پرورش پائی، "پُپرڑی" میں "دنگ" گیت نے پرورش پائی۔
"ہہرڑی" اور "پُپرڑی" نام کے دو جنگلوں کا ذکر سنتھال روایتوں میں عام ملتا ہے جہاں پہلے پہل اس قدیم النسل قوم کا آغاز ہوا۔ "دنگ" گیت سنتھالوں کا ہر دلعزیز ترانہ ہے۔ اس کی لے اتنی ہی پرانی مانی جاتی ہے جتنی کہ خود سنتھال قوم۔

۱۴

"بڑے بھیا، اندن سنگھ، مندان سنگھ
جائے چمپا گڑھ ہم سے چھن گیا بھیا!"

"مت رو، بہن، چنتا نہ کر۔
بہن تمہارے ہاتھوں کی چوڑیاں بیچ کر
بہن تمہارے کانوں کی طلائی بالیاں بیچ کر
بہن، ہم چائے چمپا گڑھ پر پھر سے قبضہ کریں گے۔

چائے چمپا گڑھ یا اس کا مخفف چمپا سنتھال تاریخ کا سنہری ورق ہے۔ ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کہاں واقع تھا۔ غالباً بنگال یا بہار میں یہ کئی صدیوں تک راجاؤں کی عظیم الشان راجدھانی بنا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں سنتھالوں نے شاندار قلعے تعمیر کئے تھے۔ بعد ازاں باہر سے حملہ آور آئے اور چائے چمپا گڑھ سے سنتھال تمدن کا جھنڈا ہمیشہ کے لئے اُٹھ گیا۔ تبھی شاید پہلی بار ان لوگوں نے جنگلوں کا رُخ کیا۔ اِندن سنگھ اور منڈان سنگھ جن کا ذکر اس گیت میں موجود ہے۔ غالباً اُسی زمانے کے دو بڑے سردار ہو گزرے ہیں جو برابر نسل در نسل ہر سنتھال کے ذہن کو گدگداتے آئے ہیں۔

۱۵

اُوپر دیس کے لڑکے لڑکیاں
نچلے دیس میں اُتر آئے
ایک بالشت پیٹ کی خاطر
روزی کی تلاش میں وہ اُترے چلے آتے ہیں۔

۱۶

زمینداروں اور شاہوکاروں نے ہمیں بالکل کنگال بنا ڈالا۔

ہمارے باٹیاں اور تھالیاں تک اُنھوں نے قُرق کرالیں۔
ہمارے پاس کوئی چیتھڑا بھی تو نہیں بچ پایا۔
بال بچے بھُوک سے مرے جاتے ہیں۔

۱۷

ہمارے دیس میں کال پڑ گیا، میرے دوست
تمھارے دیس میں اچھی فصلیں دکھائی دیتی ہیں، میرے دوست
تمھارے ہاں یہ کال پڑ جاتا تو تم کس قدر رویا کرتے
ہم تو پھر بھی جنگل سے پھل کھا کر کڑی محنت کئے جاتے ہیں، میرے دوست!

۱۸

کال پڑ جائے چاہے اچھی فصلیں نصیب ہو جائیں
ہم بھگوان کی مہما گاتے رہیں گے
آؤ ہم بھگوان کو نمسکار کریں
ہم پر دیا رکھو بھگوان!

۱۹

او میری بڑی بہن، یہ تیوہار تو برس بھر میں
لوٹ کر آجاتا ہے، او بڑی بہن
بڑی بہن رومت!
بڑی بہن چنتا نہ کر
مُنشی کی آتما لوٹ کر نہیں آتی۔

۲۰

ندی کے کنارے کنارے اُنھوں نے غدر کو جنم دیا۔

مجھے بھی گدنا گدوا دو، بڑی بہن

میرے سینے پر گدنا گدوا دو، بڑی بہن، اور اپنے سینے پر بھی

"بومبوئی تار" سانپ کی شکل کا گدنا گدوا دو۔

جس غدر کی طرف اس گیت کے شروع میں اشارہ کیا گیا ہے سنتھالوں کے ہاں "ہُول" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ۱۸۵۵ء میں شروع ہوا۔ اور پورے ایک برس بعد دب پایا۔ اس کی تہ میں باہر سے آئے ہوئے ساہوکاروں کے خلاف کھلی بغاوت کا اظہار کام کر رہا تھا جنھوں نے سنتھالوں کی خون پسینے کی کمائی کو بے ترس ہو کر ہڑپ کرنا شروع کر رکھا تھا شروع شروع میں سنتھالوں نے بے پناہ طاقت حاصل کر لی۔ اس خوشی میں ہر سنتھال لڑکی نیا گدنا گدوانے کا شوق قابو میں نہ رکھ سکی۔ کہا جاتا ہے کہ آخر میں حالت اتنی بدل گئی کہ سارے علاقے میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ یہ خیال کیا جانے لگا کہ ہر سنتھال کنواری کو فوجی سپاہی زبردستی اٹھا لے جائیں گے۔ چنانچہ گھر گھر بغیر سندھور ہی کے صرف تیل رچا کر لڑکیوں کی شادی کر دی گئی۔ اس غدر کے فوراً بعد حکومت نے سنتھال پرگنہ کو نئے قانون کے ماتحت ڈھالنے کا قصد کر لیا جس کے پیش نظر سنتھال جنتا کی اقتصادی ترقی نہایت اہم قرار دی گئی:

۲۱

اُنھوں نے ہمارا پہاڑ قرق کر لیا۔

سب کے سب درخت اُنھوں نے کاٹ گرائے
سب پرندے رو رہے ہیں۔ ہائے! درخت ہماری پناہ تھے
ہے بھگوان یہ دھرتی منشیہ کی پناہ ہے!

۲۲

گاؤں کا گاؤں میرا دشمن ہو گیا۔
دیس کا راجہ میرا دشمن ہو گیا۔
مَیں رہوں گی، میں رہوں گی، او ماں! پر مَیں کہاں رہوں گی؟
لگان دیتے دیتے، او ماں، ہم تنگ آ گئے۔
ماں کے گھر میں تو اب مَیں رہوں گی نہیں۔

۲۳

آکاش سے جل نہ برسا
پرتھوی پر فصلیں نہیں اُگ پائیں۔
ہے بھگوان دیس بھر میں کسان رو رہے ہیں۔
ہائے ہائے! کسانوں کے من ڈانوا ڈول ہوئے جاتے ہیں۔

۲۴

دل میں درد تک باقی نہیں
کھیت میں کوئی تنکا تک نظر نہیں آتا
دھرتی پر ہر کوئی ڈانوا ڈول ہو رہا ہے۔
تجھے مَیں کیا دوں؟ او بھائی، او بالک، او لڑکے؟

دھرتی پر تو ہر کوئی ڈانوا ڈول ہو رہا ہے۔

۲۵

ہائے رے بھگوان! تم نے مجھے کتنے کشٹ دیئے

میرے جنم سے لے کر اب تک

رات دن میں روتی رہی ہوں

مجھ غریبن کی زندگی بھیانک اگنی کی طرح جلتی رہی ہے۔

۲۶

سب کے سب سنتھال اور باہر سے آئے ہوئے سب کے سب ساہوکار

"ماندار" کی یاترا کو چلے جا رہے ہیں۔

ہائے رے بھگوان، او بھگوان، اکیلے میرے خاوند کو، او بھگوان

ہمارے راجہ زمیندار نے بیگار میں پکڑ لیا!

۲۷

اساڑھ میں جل برسا

ساون میں پانی کی کمی ہو گئی

کندھے پر کدال رکھے تم کھیت میں کھڑے ہو۔

ہائے کسان روتا روتا بھی رام رام کئے جاتا ہے۔

۲۸

اُوپر کی طرف جل برسا

نیچے جل نہیں برسا

بھلے بھلے کسان ٹھاکر روئے جاتے ہیں
دیکھو، ٹھاکر، سیئے کا گُن !

۲۹

اُوپر پہاڑ پر جل برسا
ندی میں کالا طوفان آگیا
ہائے ہائے کالا طوفان
ندی میں کالا طوفان آگیا۔

۳۰

اساڑھ میں جل برسا
بھادوں مہینے میں پانی کی کمی ہو گئی۔
کس طرح اپنی جان بچاؤں گی، او ماں ؟
مَیں پردیس کو چلی جاؤں گی، او ماں
کونا نہ بیچ بیچ کر، او ماں، مَیں اپنی جان بچاؤں گی۔

۳۱

ایشور نے مجھے جنم دیا
ایشور نے مجھے رُوپ دیا
ایشور ہی میرا رُوپ لے گیا
او ماں! تم نے مجھے جنم ہی کاٹ کو دیا
آدھے دِن کے لئے ؟

۳۲

سوہرائی، او سوہرائی، او بڑی سوہرائی
آؤ آؤ اب درشن دیتی جاؤ
اس دیش میں تو تم آؤ گی ہی
پر ہمارے اس گاؤں کو بھی بھول مت جانا، او سوہرائی!

سوہرائی سنتھالوں کا ہر دلعزیز قومی تیوہار ہے جو دھان کی فصل پک جانے کی خوشی میں گاؤں گاؤں میں منایا جاتا ہے۔ پوس کے مہینے میں کسی بدھوار کے روز سوہرائی ناچ کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس ناچ میں بے پناہ شراب پی جاتی ہے اور اس موقع پر جنسی آزادی کا اُفق وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

۳۳

بہن او بہن، اور میری بڑی بہن،
ہاتھی جتنا بڑا تیوہار او بہن گزرتا جا رہا ہے
اس کے ہاتھ ہوتے تو میں انہیں کھینچ لیتی، پاؤں ہوتے، تو میں
انہیں پکڑ لیتی۔
ہاتھی جتنا بڑا تیوہار، او بہن گزرتا چلا جا رہا ہے۔
دونوں ہاتھوں کی انجلی بنا کر ہم دونوں اسے نمسکار کریں گی
ہاتھی جتنا بڑا تیوہار او بہن گزرتا چلا جا رہا ہے

یہ گیت سوہرائی ناچ کے اختتام پر گایا جاتا ہے۔ جبکہ ڈھول لئے اپنے تال میں ایک سُبک اور متحرک گونج پیدا کر دیتے ہیں لیکن ناچ کی فضا اُداس اُداس

ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہر شخص سوہرائی کو الوداع کہنے کے خیال سے غمگین ہو اُٹھتا ہے اس گیت میں جو تصویر پیش کی گئی ہے، وہ نری رومان کی شے نہیں بلکہ حقیقت کی سرحد کو چھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

ہر سنتھال ناچ رات ہی کو ناچا جاتا ہے۔ کوئی تیوہار ناچ سے بے نیاز نہیں ناچ ہی سنتھالوں کا مذہب ہے۔ ناچ ہی ان کی زندہ تعلیم ہے۔ ناچ کے ساتھ ہی بہار میں واقع سنتھال پرگنہ میں جہاں کوئی ساڑھے چھ لاکھ سنتھال بستے ہیں، زندگی شروع ہوتی ہے اور ناچ ہی کے ساتھ زندگی کی ٹمٹماتی ہوئی بتیاں بجھ جاتی ہیں۔ شاید پھر سے جل اُٹھنے کے لئے۔

تاروں کا غبار ڈھل رہا تھا۔ اُشا قریب تھی۔ شانتی نکیتن کے جنم دن پر آئے ہوئے سب یاتری اور وہاں کے لڑکے اور لڑکیاں واپس چلے گئے تھے۔ مگر میں بدستور سنتھالوں کی رنگ بھومی پر آسن جمائے بیٹھا تھا۔ ڈھول بج رہے تھے۔ بنسریاں مدھ بھرے سُروں کا الاپ کر رہی تھیں۔ سنتھال لوک گیت کبھی رومان کی طرف مُڑ جاتے تھے، کبھی زندگی کی سنگین حقیقتوں کی طرف۔ میں سوچ رہا تھا کہ اُشا کچھ دیر کے لئے ضرور رُک جائے گی۔ تاکہ یہ رنگ بھومی تھوڑی اور پی لے، تھوڑی اور تھرک لے، اس سے پیشتر کہ یہ دھرتی کے بیٹے پھر سے زندگی کے تلخ گھونٹ پینے کے لئے اپنے کو تیار کر سکیں۔

گوداوری کے کنارے

جی چاہتا تھا کہ کشتی رُکے نہیں، چلتی ہی رہے، چلتی ہی چلی جائے۔ میرا اور اور اس ملّاح کا مقابلہ ہی کیا، میں نے سوچا، وہ کھُلے آزاد پانیوں کا بیٹا ہے، لمبا قد، تنے ہوئے پٹھے۔ چوڑا سینہ — چالیس انگل سے تو کیا کم ہوگا۔ خالی ہاتھ دس آدمیوں کو پچھاڑ سکنے کی ہمّت۔ آنکھوں میں ایک گستاخ مسکراہٹ، ہو بہو منجھے ہوئے تانبے جیسا رنگ۔ اتنی کمی رہ گئی تھی کہ لنگوٹی جسم کی ہم رنگ نہ تھی۔ تنا ہُوا سینہ، تنے ہوئے بازو، تنی ہوئی رانیں اور پنڈلیاں — اُس کے اندر ربڑ کے غبارے خوب دبا کر بھر دیئے گئے تھے۔ اور سر پر گھنگھریلے بالوں نے ضرور کسی بھنور کو دیکھ کر گول مول کنڈلوں میں لٹتے رہنے کا ڈھب سیکھ لیا تھا۔ کھُلے آزاد پانیوں کی ایک ایک تفصیل اُسے یاد تھی۔ بھیانک طوفانوں کی بھیانک کہانیاں اُسے ورثے میں ملی تھیں۔ کھُلی آزاد ہواؤں سے کھیلتے کھیلتے

اُس کا بچپن بیتا۔ اب جوانی کی شگفتگی بھی بہت کچھ ان ہواؤں کی احسان مند تھی۔ پانی ہی پانی ۔۔ ہمیشہ بہتا ہوا پانی۔ دریائی گھاسوں کی خوشبوؤں میں بسے ہوئے تھے اُس کے سپنے۔ اور یہ بھی ظاہر تھا کہ گوداوری نے اپنے حسین نغمے اُسے جی بھر کر سنائے تھے۔

اب اُس کی گستاخ مسکراہٹ بہت حسین ہو چلی تھی۔ کسی کھچا کھچ بھر جانے والی کشتی میں اس تنہائی کا رس اُسے ہرگز نہ آسکتا۔ ہماری یہ کشتی چھوٹی تھی چنانچہ کافی کم دام دینے ہی کی بات تھی۔ دُوسرے یہ کہ میں صرف اشاروں ہی سے کام لے رہا تھا۔ نہ میں اُس کی زبان جانتا تھا پوری پوری، نہ وہ میری زبان سمجھتا تھا۔ اُس کی مسکراہٹ نے کئی رنگ بدلے، اور جس رنگ پر پہنچ کر یہ رُکی کی رُکی رہ گئی اُس سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وُہ مجھے اچھے دوستوں کی فہرست میں شامل کر چکا تھا۔

اگر وہ میری زبان سمجھتا ہوتا یا اگر میں ہی تیلگو بول سکتا، تو میں نے اُسے میکسم گورکی کے الفاظ میں ادب سے متعلق اپنا نظریہ سمجھا دیا ہوتا۔۔ عرشی اور عرضی کی بحث تو بہت پراچین ہے، وہ ادیب جو سدا آکاش پر نظر رکھتے ہیں اُن کی خدمت میں مَیں صرف یہ کہنے کی دلیری کرتا ہوں کہ ہماری دھرتی بھی ایک روشن ستارہ ہے، اُس کی مسکراہٹ پھیکی پڑ چکی تھی، جیسے وہ کہنا چاہتا ہو کہ ہو گی یہ دھرتی ایک ستارہ تمہاری نگاہ میں، لیکن بھائی میرے، پہلے مجھے تو دیکھو، کتنی محنت کرتا ہوں اور اس پر بھی ہمیشہ بھر پیٹ کھانا نصیب نہیں ہوتا۔

گوداوری کے پھیلے ہوئے پانیوں پر دُھوپ کی چمک نے چاندی کا پانی پھیر دیا تھا۔ وہ ہمارے غم بات سے بے نیاز کیسے رہ سکتی تھی؛ جیسے وہ کہہ رہی تھی ۔۔

میں نے تو تاریخ کے بدلتے ہوئے اوراق دیکھے ہیں۔ میرے پانیوں میں کتنی بار میرے بیٹوں کا لہو بھی شامل ہوتا رہا ہے۔ میں نے تلواروں کی لڑائیاں دیکھی ہیں، نیزوں اور بھالوں کے خونی کرتب بھی دیکھے ہیں۔ میرے دیکھتے دیکھتے کتنی راج قائم ہوئے۔ لیکن اب جو زمانہ آنے والا ہے وہ محنت کش کو سب سے اونچا درجہ دے گا، اُسے کبھی بھوکوں نہ ماریگا۔

گوداوری مجھے پہچانتی تھی۔ اس سے پہلے ہم مہاراشٹر میں مل چکے تھے۔ اُسے شاید وہ دن بھی تو یاد تھا جب ناسک کے پچھم میں اٹھارہ میل پر واقعہ ترمبک میں جا کر میں نے اُس کا جنم استھان بھی دیکھ لیا تھا۔ ترمبک کی بستی سے اوپر پتھر کی سو دو سو نہیں پوری چھ سو نوے سیڑھیاں میں نے جھٹ طے کر لی تھیں اور گومکھ کو دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی جس میں سے گوداوری کا شیتل جل نیچے گر رہا تھا۔ پہاڑوں کی اس دیو قد دیوار کے اس پار پچاس ہی میل پر بحیرہ عرب واقع تھا، اور میں اس سوچ میں ڈوبا ہوا کھڑا تھا کہ کس طرح گوداوری نے ایک دور دراز سفر کی بات ٹھان لی تھی — ۹۰۰ میل لمبے سفر کی بات! اور ترمبک اور ناسک کے درمیان گنگا پور کی ۳۲ فٹ اونچی آبشار دیکھ کر تو میں کہہ اٹھا تھا — "گوداوری! مجھے بھول مت جانا، میں بھی تیرا یہ منظر رہتی دنیا تک یاد رکھوں گا!" ناسک تو میں نے جی بھر کر دیکھا تھا۔ ست کنڈ، اور رام کنڈ اور لکشمن کنڈ کو دیکھتے دیکھتے رام بن باس کی کہانی میری آنکھوں میں پھر گئی تھی۔ وہ گپھا دیکھی تھی جس سے پنچ وٹی کی داستان وابستہ تھی۔ رام سیج پہاڑی دیکھی جس پر ان گنت بار رام نے اپنی سیج بچھائی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ گوداوری اُن پرانے دنوں کی تاریخ ابھی تک بھولی نہ تھی۔ لیکن مہاشور پراپتی کا قصہ اُسے بھی بہت مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ ان گنت سادھوؤں اور سنتوں پر وہ من ہی من میں ہنس دیتی تھی، جہاں روٹی کا

سوالی کٹھن سے کٹھن ہوتا جا رہا تھا۔ وہاں خدا کی تلاش کتنی بے معنی ہو کر لگائی تھی۔

پاس کے گاؤں کے مندر سے گھنٹیوں کی آواز آرہی تھی۔ میں جھنجھلا کر رہ گیا۔ ملاح کی آنکھوں میں ایک نئی ہی چمک آگئی تھی۔ اپنی گھنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے میں نے جھنجھلا کر ان گھنٹیوں کے خلاف اپنا غصہ انڈیل دیا۔ "بے شرم گھنٹیاں! ان گنت صدیوں سے یہ ہمارے دیس کو افیم پلا رہی ہیں!" اور اسی غصے میں میں نے اپنی داڑھی کے دو چار بال نوچ کر گوداوری کے پانیوں پر پھینک دیئے۔ گوداوری پہلی چال سے بہتی رہی۔ اُسے میری یہ حرکت اچھی نہ لگی ہوگی، یہ سوچ کر میں کھسیانہ سا ہو گیا۔ ملاح کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو وہاں بھی قدرے بے توجہی کا جذبہ نمودار ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا! مجھے اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیئے۔ گھنٹیاں تو بُری نہیں۔ نزدیک مستقبل میں ہم صرف ان کے معنی بدل ڈالیں گے۔

ملاح کی طرف میں نے گہری رفاقت سے دیکھا۔ میں کہنا چاہتا تھا۔۔ اوبھلے بھائی، میں بھی کوئی نفع باز امیر نہیں، تمہاری طرح مزدور ہی تو ہوں۔ تم کشتی چلاتے ہو اور میں قلم چلایا کرتا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ کشتی کا چپّو تمہارے مضبوط پٹھوں کی جنبش چاہتا ہے اور میرا قلم ذہانت کی بجلی مانگتا ہے ہر دم۔ دیکھو تمہاری یہ بے توجہی تو اچھی نہیں، اور یونہی میں نے کشتی سے جھک کر دیکھا، گوداوری نے ایک ردپہلی لہر کے رُوپ میں اپنی بانہہ اُوپر اٹھا دی تھی۔ شاید وہ مجھے آشیرباد دینا چاہتی تھی۔ وہ لہر تو پیچھے رہ گئی، اب گوداوری گویا زبانِ حال سے کہہ رہی تھی ۔۔۔ "تم سب مزدور مزدور ایک ہو جاؤ تو تمہارے صدیوں کے غم ایک ہی دن میں مٹ سکتے ہیں!"

گوداوری مسکرا رہی تھی۔ شاید اُسے اپنی شکتی کا احساس ہو چکا تھا۔ اپنے

لمبے سفر کے خیال سے وہ پھولی نہ سماتی تھی۔ جب سے اس نے جنم لیا وہ ایک دن کے لئے بھی سوئی نہ تھی۔ دن کو تو سب جنتا جاگتی تھی۔ لیکن رتجگا تو کبھی کبھی آتا تھا لیکن گوداوری نے اپنی عمر کی سب کی سب راتیں رتجگے میں گزار دی تھیں۔ شاید وہ کہنا چاہتی تھی "علامتی طور پر کوئی بڑی ندی ہی جنتا کو اپنی چھپی ہوئی شکتی پہچاننے کے لئے اُکسا سکتی ہے۔ ترمبک سے تو میں صرف اپنے ہی بل بوتے پر چل پڑی تھی۔ پھر کناروں سے کئی ندی نالے اپنا اپنا پانی دے کر آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے رہے۔ کوئی ساڑھے چھ سو میل کا سفر میں نے اسی طرح طے کر لیا۔ پھر اُتر کی جانب سے وردھا ندی آکر میرے گلے لگ گئی۔ پین گنگا اور وین گنگا نے پہلے آپس میں ایک بڑی ندی کو جنم دیا اور پھر اس بڑی ندی "پرن ہتا" نے اپنی سب دولت مجھے سونپ دی۔ اُتر کی طرف سے پھر بہن اندراوتی دوڑی دوڑی آئی اور مجھ میں سما گئی، اور پھر میری خوشی کی حد نہ رہی جب شبری بھی پوربی گھاٹ کا بے پناہ پانی سمیٹے ہوئے میرے ساتھ شامل ہو گئی۔"

گوداوری کی مسکراہٹ اب اور بھی نمایاں ہو گئی تھی۔ میں نے کہا "گوداوری میّا! تم سچ کہتی ہو، جیسے زیادہ سے زیادہ ووٹ ملنے سے ایک نمائندے کی حیثیت بڑھ جاتی ہے اُسی طرح ایک بڑی ندی چھوٹی ندیوں کا پانی پا کر زیادہ سے زیادہ نمائندہ بن جاتی ہے۔ مجھے تو جاگی ہوئی جنتا اور ایک بڑی ندی میں زیادہ فرق نظر نہیں آتا۔"

ملّاح نے اپنی پتلی آواز میں کوئی پرانا گیت چھیڑ دیا تھا۔ شاید یہ کوئی گوداوری کا گیت تھا مگر میرے لئے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ بار بار تو درکنار گوداوری کا نام اس کے گیت میں ایک بار بھی نہ آیا تھا۔ اُس کے شانے پر اپنی بانہہ ٹیک کر میں نے اپنی بیاض کے ایک ورق میں سے تیلگو زبان کی ایک کہاوت خالص آندھر تلفظ میں پڑھ دی۔ "کبھی

گھوڑے کانور غریبی امیری

کلیمڑی کاوڑی کُنڈلُو! (कलिमि लेमिड़ी कावड़ि कुण्डलू) —

یعنی امیری غریبی ایک ہی کانور کے دو گھڑوں کی طرح ہیں'۔ ملاح کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ وہ خوش تھا کہ میں اُس کی زبان کے یہ چار الفاظ بالکل آندھر تلفظ کے ساتھ ادا کرسکا تھا۔ اس کے لئے مجھے کتنی کاوش میں سے گزرنا پڑا تھا اس کا اُسے کچھ علم نہ ہو سکتا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی چمک سے ظاہر تھا کہ وہ اس ضرب المثل کی شدید حقیقت کا قائل ہے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ یہ سمجھ لے کہ آئندہ مستقبل میں پُرانی کہاوتوں کی اندھی غلامی قائم نہ رہ سکے گی بہت سی کہاوتیں امیروں کی بنائی ہوئی تھیں جن میں غریبوں کو صبر اور قناعت کی تعلیم دی گئی تھی۔ یہ صرف غریبوں کی بغاوت کو دبائے رکھنے کا سامان تھا۔ ایسی سب کہاوتیں صرف تاریخی حیثیت کے طور پر سامنے آیا کریں گی۔ جنتا کے لئے یہ پہلے کی طرح پگڈنڈیاں دبی رہیں گی کہ وہ بغیر دیکھے غلامانہ طور پر ان پر چل کر اپنی منزل پر پہنچنے کی کوشش کرتی رہے۔ ملاح بدستور مسکرا رہا تھا اور مجھے اُس پر غصہ آنے کی بجائے اپنے اُوپر غصہ آنے لگا۔

گوداوری کی لہروں سے تیز ہوا نے کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ کاکا کالیلکر کے الفاظ میری بیاض میں اَور بھی چمک اُٹھے: "گوداوری کی ساری کلا تو بھدراچلم سے ہی دیکھی جا سکتی ہے جس کا پاٹ ایک سے دو میل تک چوڑا ہے۔ ایسی گوداوری اُونچے اُونچے پہاڑوں کے بیچ میں سے ہو کر اپنا راستہ صاف کرتی ہوئی نکلتی ہو گی تب بھلا وہ کیا سوچتی ہو گی؟ اپنی تمام طاقت اور ترکیب خرچ کر کے بڑے ہی نازک موقع میں سے نکل کر قوم کو آگے لے جانے والے کسی قومی رہنما کی طرح دُنیا کو حیرت میں ڈالنے والی گرج کے ساتھ وہ یہاں سے نکلتی ہے گھوڑا باڑھ اور ہاتھی باڑھ کی باتیں تو ہم سنتے رہے ہیں لیکن یک دم پچاس فٹ جتنی اُونچی باڑھ کیا کبھی تخیل میں بھی آ سکتی ہے؟ مگر جو تخیل میں ممکن نہیں وہ گوداوری کے بہاؤ

ہیں ممکن ہے۔ تنگ گلی سے ہو کر نکلتے ہوئے پانی کو اپنی سطح ہموار بنائے رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ارگھ دیتے وقت جیسے انجلی میں چھوٹے مُنہ کی نالی سی بن جاتی ہے ویسے ہی کھائی میں سے گزرتے ہوئے پانی کی سطح کی بھی ایک بھیانک نالی بن جاتی ہے۔ مگر حیرت کا چمتکار تو اس کے آگے ہے۔ اس نالی میں سے اپنی ناؤ کو لے جانے والے کئی باہمت ملّاح بھی وہاں پڑے ہوئے ہیں۔ ناؤ کے دونوں طرف پانی کی اونچی اونچی دیواروں کو ناؤ ہی کی روانی سے دوڑتے دیکھ کر آدمی کے من پر کیا بیتتی ہوگی؟"

پھر اپنے ملّاح کی طرف نگاہ اٹھائی تو وہ کسی یاد میں کھویا ہوا سا چپو چلائے جا رہا تھا جیسے وہ اپنی کسی بھدراچلم یاترا کے بارے میں سوچ رہا ہو۔ اس نے ایک بار میری طرف دیکھا جیسے وہ کہنا چاہتا ہو ——"میں تمہیں اُدھر لے چلوں گا کسی روز۔ گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ بھدراچلم تو اپنا گھر ہی ٹھہرا۔ دیوتا کے درشن بھی کر لینا۔ قدرت کی بیٹی اس گوداوری میّا کی نرالی شان بھی دیکھ لینا۔"

جی چاہتا تھا خوب اچھلوں اور زور زور سے قہقہے لگاؤں۔ اس وقت میرے ذہن میں ربّیا دیوتا کی تصویر اجاگر ہو گئی تھی۔ آج تک کسی نے اس دیوتا کے درشن نہ کئے تھے لیکن اس کا دھیان کرتے وقت ہر ملّاح بے پناہ عقیدت کا اظہار کرتا تھا۔ وہ پہاڑ جس میں سے ہو کر گوداوری ایک بھیانک پن چادر کا منظر پیش کرتی ہوئی بہتی چلی گئی تھی، ربّیا کونڈا کے نام سے مشہور تھا۔ یہ پہاڑ اس دیوتا کی قیام گاہ تھا —— ربّیا کونڈا یعنی ربّیا کا پہاڑ۔ گوداوری میّا کے جنم سے بہت پہلے ہی اس دیوتا نے اِدھر اپنی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ پھر جب گوداوری آئی تو اُسے اس شرط پر راستہ دیا گیا تھا کہ وہ یہاں ملّاحوں کو ہمیشہ ربّیا کے بھگت بننے کی تلقین کرتی رہے۔ سچ پوچھو تو اُس وقت وہ

چالیس انگل چوڑے سینے والا دیوؤں ملاح بریتا کے رُوپ میں نظر آرہا تھا۔

جھم جھم کی مسکراہٹیں میرے سینے کے پاتال سے باہر آیا چاہتی تھیں۔ ملاح کے چہرے پر بھی بے پناہ اطمینان جھلک رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ وہ کوئی تان چھیڑ دے۔ اپنے اس دیوتا کی زبان سے نہ واقف ہوتا تو میں خود اُسے کہتا کہ وہ آنے والی خوشیوں کی پیش قدمی میں کوئی آزادی کا نغمہ سُنائے۔ گوداوری کی لہریں ناچ رہی تھیں، میرے دِل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی تھی۔ دُور سے کسی دوسرے ملاح کے گانے کی آواز کسی کی پازیب کی جھنکار کی طرح بہتی ہوئی آنے لگی۔ نہ جانے یہ کیسا نغمہ تھا۔ شاید یہ لال دُشا کا لال نغمہ تھا۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر سُننے لگا۔ اُشا کا تو رِگ وید کے رِشیوں تک نے سواگت کیا تھا۔ جیسے اُشا سُوکت کے بیدار مغز رشی صدیوں کی نیند سے جاگ اُٹھے ہوں۔ اُشا آیا ہی چاہتی تھی۔ . . . . .

شاعر کے الفاظ بار بار گنگنانے کو جی للچا رہا تھا — "شام تھی دُھواں دُھواں، رات تھی اُداس اُداس، دِل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں"! لیکن اب تو ماضی کے سینے میں جھانکنے کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ اب تو لال اُشا آیا چاہتی تھی۔

میرا ذہن ایک بار پھر ترمبک کی طرف گھوم گیا۔ ترمبک سے گنگاپور کی آبشار یا زیادہ سے زیادہ ناسک پہنچنے سے پہلے تک گوداوری ایک لڑکی ہی تو تھی جو بچپن کے دور سے گزر رہی ہو۔ پھر یہ جوان ہونے لگتی ہے۔ اور بھدرا چلم سے راج مندری تک اِسے ہم ایک دُلہن کے رُوپ میں دیکھ سکتے ہیں۔ راج مندری کے قریب یہ دو میل سے تو کیا کم چوڑی ہو گی۔ راج مندری سے پانچ میل پر دھولیشور ہے جہاں اِس ندی کا پاٹ چار میل ہو جاتا ہے۔ گو اس کا تین چوتھائی حصّہ تین ٹاپوؤں سے گھرا ہُوا ہے۔ ایسے ٹاپو تو اِدھر بہت ہیں — کچھ روایات کی طرح دائمی، کچھ نت نت کے سپنوں کی طرح بننے بگڑنے

کے عادی۔ ہر ٹاپولنکا کہلاتا ہے۔ دائمی ٹاپوؤں پر کاشت بھی خوب ہوتی ہے۔

روایت ہے کہ گوداوری کو گوتم رشی شوکی جٹاؤں سے نکال کر لائے تھے اور پرانے وقتوں میں یہ سات شاخوں میں بٹ کر سمندر میں گرتی تھی۔ آج تک یہ ساتوں کے ساتوں مقامات سوابتنے زندہ رکھ چھوڑے ہیں۔ گو گوداوری الگ ہی دو مقامات پر سمندر میں گرتی ہے۔ اُن ساتوں مقامات پر پرانے خیالات کے لوگ اولاد کی خاطر اشنان کو جایا کرتے ہیں اور سپت ساگر یاترا کے نام سے اس کی اہمیت بیان کرتے کبھی تھکتے نہیں۔ اس کے علاوہ ہر بارھویں برس راج مندری اور گوداوری کے دوسرے شہروں میں پشکرم اتسب منایا جاتا ہے جبکہ گوداوری کے پانیوں میں ہر کوئی نہاتا نظر آتا ہے۔

کہتے ہیں پرانے وقتوں میں سات رشیوں نے اپنی بے پناہ شکتی سے گوداوری کو سات شاخوں میں بٹنے پر آمادہ کیا تھا۔ اب اُن رشیوں کی داد کوئی دینا بھی چاہے تو کیسے دے۔ اب تو گوداوری صرف دو شاخوں میں بٹ کر سمندر میں گرتی ہے۔ دھولیشور تک تو گوداوری کا مکمل روپ ہی نظر آتا ہے۔ پھر یہاں سے گوتمی گوداوری یا پوربی گوداوری انجارم، یانام کی فرانسیسی بستی اور نیلا پلی کو چھوتی ہوئی پوئنٹ گوداوری (Point Godavari) پھر سمندر میں گرتی ہے اور وسشٹ گوداوری یا پچھمی گوداوری دکن کی جانب بہتی ہے اور پوئنٹ نرساپور (Point Narsapur) کے مقام پر سمندر میں گرتی ہے۔

دھولیشورم میں دورِ حاضر کے انجنیئروں نے چار میل چوڑے پاٹ پر اینی کٹ (Ani-cut) بنا کر بڑے سے بڑے رشیوں کے معجزوں کو شرما دیا ہے اور پھر لوپانی کو اپنے بس میں کرنے کے بعد ایسی ایسی نہریں نکالی ہیں جن سے کوئی اڑھائی لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہوتی ہے۔ ان سائنس کے رشیوں کو نمسکار کرنے کو جی

چاہتا ہے جنہوں نے پیاسی دھرتی کو پانی پلانے کی عظیم خدمت سرانجام دی ہے۔ اور اُن کے اِس معجزے کی بدولت اب بے پناہ اناج پیدا ہوتا ہے۔

دھولیشور پہنچ کر میں نے ملاح کو اُس کی مزدوری کے پیسے دیئے اور مُسکرا کر اشارے ہی سے الوداع ہو کر کشتی سے اُتر پڑا۔ گوداوری مسکرا رہی تھی۔ یہاں سے وہ جنتا کی ماں بن گئی تھی۔ "تم دھنیہ ہو گوداوری میّا!" میں نے کہا "تم نے ہمیشہ تاریخ کو بدلتے دیکھا ہے۔ تم نے ہمیشہ اپنے کھلے آزاد پانیوں کا نغمہ بلند کیا ہے۔"

گوداوری کے کنارے میں نئی لہروں کو گننے کی کوششیں کر رہا تھا۔ کھلی آزاد ہوائیں مجھے جھنجھوڑ رہی تھیں۔ وہ ملاح میرے قریب سے پرے جانے کا نام نہ لیتا تھا۔ امیری غریبی کو ایک ہی کاڑر کے دو گھڑے ماننے کے لئے وہ ہرگز ہرگز تیار نہ تھا اور گوداوری خوش تھی۔

مالابار کے پانیوں پر

ہم پانچ ساتھی تھے۔ میں پنجابی اور وہ چاروں مالاباری — ایک تھا شاعر، جو میرے سب سے زیادہ قریب تھا، باقی تینوں بالترتیب افسانہ نگار، ڈراماٹسٹ اور مصوّر تھے۔ اُن کے علاوہ دو اور مالاباری بھی تو تھے — ہمارے دونوں ملّاح، یعنی باپ بیٹا۔

سٹیمر میں سفر کرنے کے خلاف میں نے ہی آواز اُٹھائی تھی۔ ترِیوِنڈرم میں ٹراونکور یونیورسٹی نے مجھے "ہندوستان میں لوک گیتوں کی تحریک" پر تقریر کرنے کی دعوت دی تھی۔ چاروں ساتھی تقریر کے فوراً بعد مجھے صدیوں کے دوستوں کی طرح ملے۔ وہ میرے ہمراہ ارناکلم تک سفر کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور میرے اصرار کرنے پر انہوں نے سٹیمر کی بجائے کشتی میں سفر کرنے کی بات منظور کر لی۔ راستے میں زیادہ دیر لگے اور ہم جی بھر کر مالابار کے پانیوں کا اَلوٹ منظر دیکھتے چلے جائیں، یہی

میرا زاویۂ نگاہ تھا۔ تقریر کے اختتام پر یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ریاست کے دیوان سر سی۔ پی راماسوامی آئر نے اپنی صدارتی تقریر میں مالاباری ملاحوں کے گیتوں کی طرف خاص توجہ دلائی تھی اور ہمارے شاعر ساتھی کا خیال تھا کہ یہ گیت تو اہم اور خوبصورت تھے ہی، مالابار کے دوسرے لوک گیت بھی شعر و نغمہ کے لحاظ سے ہندوستان کے کسی دوسرے صوبوں کے گیتوں سے کم نہ تھے۔ ٹریونڈرم سے کوئی لون تک پینتالیس میل کا سفر ہم نے بس پہ طے کیا تھا۔ وہاں بھی راستے بھر وہ کبھی کوئی نغمہ چھیڑ دیتا اور پھر موقع پا کر خود ہی ان نغموں کی حمایت میں تعریف کے پل باندھ دیتا۔ کوئی لون میں بھکمنگے چھوکروں کے گیت مجھے بے حد پسند آئے تھے اور انہیں پوری تندہی سے میں نے اپنے مجموعے کے لئے نقل بھی کر لیا تھا، اپنے ساتھیوں کی مدد سے میں نے ان کا ترجمہ بھی کر ڈالا تھا اور اپنے معتدل انداز میں ان کی خوبصورتی کے بارے میں بھی کچھ اظہار کر دیا تھا۔ لیکن میرے شاعر ساتھی نے اسے میرے خام انداز سے منسوب کیا تو میں من ہی من میں اس جذباتی ماحول کو کوسنے لگا جس میں اس نے پرورش پائی تھی۔

چاندنی اتنی پُرکشش تھی کہ میرا ذہن ٹٹول ٹٹول کر چلنے والے مسافر کا انداز چھوڑ کر لہروں پر تیرنے والا کنول بن گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مجھے اپنی ڈنڈی سے جدا ہوئے ان گنت صدیاں بیت چکی ہیں اور یہ لہریں، جن پر میں تیر رہا ہوں، ہمیشہ ہمیشہ تھرکتی رہیں گی۔ اور سچ تو یہ تھا کہ اس کشتی پر ہم ساتوں آدمیوں میں ایک معنی خیز ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔ جیسے کوئی یوگی چپ سادھے بیٹھا ہو، یوں نظر آتا تھا میرا مصور ساتھی۔ شاید وہ سامنے کے ناریل کے اونچے اونچے پیڑوں کو اپنی کسی تصویر میں دکھلانے کی بات سوچ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کب تک اسی آسن میں بیٹھا رہے گا، میں نے سوچا، نہ جانے کب سے یہ

پیڑ یہاں کھڑے دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔

شاعر بولا "سُنو! وُہ کوئی بنسری بجا رہا ہے۔"

بنسری بج رہی تھی، جیسے کوئی گوپی، اپنے دونوں ہاتھوں سے دل کو دبائے ہوئے ابھی بھٹکتی چلی جاتی ہو اپنے کنھیا کی طرف۔ کشتی پر پوری جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔ اور ہم کھڑکی میں سے دور، بہت دُور دیکھ رہے تھے۔ جدھر سے یہ کنواری لے تیرتی ہوئی ہم تک پہنچ رہی تھی۔

شاعر کہہ رہا تھا "میری شاعری تو کوئل کی کوک کی طرح ہے۔ روپے کے لئے مَیں کبھی شعر نہیں کہتا۔"

ملّاح اور اس کا بیٹا دو محنت کش تھے۔ دُور کے خاموش ناریل کے پیڑوں کی طرح وہ چاندنی رات کے مداح تھے ضرور، لیکن وہ روپیہ کے بغیر کشتی نہ چلا سکتے تھے۔

مَیں نے کہا "مَیں ایسا شاعر نہیں بن سکتا۔ مَیں تو مزدُور ہوں۔"

ڈراماٹسٹ، افسانہ نگار اور مصوّر تینوں یک زبان ہو کر بولے۔ "ہم بھی مزدور ہیں۔"

دونوں ملّاح گھبرا گئے۔ ہماری زبان سے وہ ناواقف تھے۔ اُنہوں نے سمجھا ہو گا کہ ہم میں کوئی جھگڑا ہو گیا ہے۔ اس وقت میرے کانوں میں کوئی دُور کے بھِک منگے چھوکرے کا وہ نغمہ گونج اٹھا جسے میں نے کچھ ہی [illegible] ہوئے بستی کے قریب محسوس کیا تھا۔ میری نگاہ میں وہ بھکمنگا نہیں تھا ایک مزدور تھا۔ شاعر کی طرف میں نے گھور کر دیکھا، جذباتی ماحول سے چھٹی پا کر وہ حقیقت پسندی کی دنیا میں سانس لینا شروع کرے، یہی میں اسے بتلانا چاہتا تھا۔

دائیں طرف مغربی گھاٹ کے پہاڑ تھے اور بائیں طرف بحیرۂ عرب اور ان

پانیوں کے بیچ کی زمین۔ مغربی گھاٹ کا تمام پانی ان جھیلوں میں آکر گرتا ہے۔ شروع میں ان جھیلوں کا سلسلہ ٹوٹا نہ تھا۔ پھر انسانی دماغ نے آگے بڑھ کر نہریں کھودنے کی تجویز نکالی اور اب ان پانیوں سے آمد و رفت میں بہت آسانی ہو گئی تھی۔ سڑکیں ادھر کم ہیں۔ آب و ہوا کی مجبوری سمجھئے لیکن ساحل کے متوازی یہ پانیوں کی سڑک اور پھر اس قدر لمبی سڑک سارے ہندوستان میں بس ایک ہی ہے۔

افسانہ نگار کہہ رہا تھا۔ "جنوری، فروری اور مارچ، یہ ہمارے خشک مہینے ہیں۔ اس موسم میں خشکی کی گرم ہواؤں کا سامنا رہتا ہے۔ تب شام کو سمندر کی طرف سے ٹھنڈی ہوائیں چل پڑتی ہیں اور طبیعت بہل جاتی ہے۔ شروع اپریل میں مغربی گھاٹ پر بجلیاں کڑکتی ہیں، کھیت بو دیئے جاتے ہیں۔ پھر مئی میں جنوب مغرب سے نیلے کالے بادل اُٹھ اُٹھ کر مون سون کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ اب جب دیکھو بارش ہی بارش۔ ان پانیوں پر جوبن آجاتا ہے۔ اگست میں جا کر کہیں یہ بارشیں ڈھیل پاتی ہیں، ویسے اِکا دُکا بوچھاڑیں تو دسمبر تک ختم نہیں ہوتیں۔"

ڈرامائسٹ بولا۔ "اتنی بارشوں کے باوجود ہمارے کسان مالابار کی ضرورت کا اناج پیدا نہیں کر پاتے۔ کافی اناج باہر سے منگوانا پڑتا ہے۔"

مَیں نے کہا۔ "آپ میں سے کوئی صاحب اگر یہ بتا سکیں کہ مالابار نام کیسے پڑا۔ تو میرا استعجاب ہٹ سکے۔"

شاعر اس پر بھی کچھ نہ بولا۔ ڈرامائسٹ میری رہنمائی کے لئے حاضر تھا۔ "مالابار لفظ کا استعمال تاریخ میں پہلے پہل البیرونی نے کیا تھا۔ لیکن اُس سے بہت پہلے ایک مصری سوداگر نے ہندوستان کے مغربی ساحل پر مالے نام کے قصبہ کا ذکر کیا ہے جو اُس کی نگاہ میں کالی مرچ

کا سب سے بڑا اوساور تھا۔ مالابار مالے بار سے بگڑ کر بنا ہوگا۔ اب اُس مالے نام سے تعصب کی تو بو بھی جھڑ چکی ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ مالابار مالا اور بار ان دو لفظوں کا مرہونِ منت ہے۔ مالا ملیالم میں پہاڑی کو کہتے ہیں اور بار ہمارے لئے پردیسی لفظ ہے۔ شاید اس کا مفہوم ملک ہوتا ہے۔ مالابار کے لئے ہمارا اپنا نام ملیالم ہے۔۔۔ یعنی پہاڑیوں کا دیس۔ اب یہ نام ہماری زبان کے لئے منسوب ہو چکا ہے۔۔۔ پہاڑیوں کے دیس کی زبان۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ملیالم یا مالابار کی بجائے ہمیں کیرل لفظ سے پیار ہے جو ہماری جنم بھومی کا پراچین نام ہے۔"

افسانہ نگار نے مسکرا کر کہا: "یہ افسانہ اس سے کہیں پرانا ہے۔ پرانوں میں کئی جگہ اس دیس کو پرشرام کشیترم کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ روایت ہے کہ پہلے یہ دھرتی سمندر کے نیچے تھی اور بحیرۂ عرب کا ساحل مغربی گھاٹ کے پہاڑوں کے قدم چھوتا نظر آتا تھا۔ برہمن جودھا رشی پرشرام نے اپنی ہمت سے اسے سمندر سے باہر نکالا تھا۔ پرشرام اب تک ہمارے ہاں دیوتا کی طرح پوجا جاتا ہے۔ دیکھنے میں یہ بات نری گپ سی نظر آتی ہے لیکن ارضیات کے ماہروں کی سنئے تو وہ بھی بتلاتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہ سب علاقہ سمندر کے نیچے رہ چکا ہے اور پھر کسی زلزلے یا آتش فشانی ہلچل کے سبب یہ خطۂ زمین جو بحیرۂ عرب اور ملابار کے پانیوں کے درمیان واقع ہے پیدا ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ آج سے کوئی ایک ہزار سال پیشتر یہاں سب جگہ پانی ہی پانی تھا۔ وہ ٹھاٹھیں مارتا سمندر۔ پرانک پنڈت پرشرام کے بڑپن کا ڈھنڈورہ پیٹا کرتے ہیں۔ کچھ محققین کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ ناگ نسل کا کوئی فوجی سردار تھا جس نے پرشرام نام رکھ کر راجدھانی حاصل کر لی تھی اور آریہ نو آبادی کا آغاز کرنے میں کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھ کر پھولا نہ سمایا تھا۔"

شاعر چپ بیٹھا تھا۔ وہ بولا: "آپ تو اب لگے ہاتھوں کیرل کا افسانہ بھی سنا ڈالو۔"

افسانہ نگار پہلے سے تیار تھا، بولا "میں سب سناؤں گا۔ خانہ بدوش ادیب کہیں اُب نہ جائے، مجھے تو بس یہی ڈر ہے"۔

میں نے کہا "میں تو ممنون ہوں بھئی دِل کھول کر سناؤ کیرل کا افسانہ"

وہ کہہ رہا تھا "کیرلم یا کیرل سے مُراد ہے، چیر راجاؤں کی سرزمین، کرناٹک کی کنڑ زبان کے اثر سے چیرم سے بگڑ کر کیرم بن گیا۔ یوں یہ دیس تین ہندو شاہی خاندانوں چیرا، چولا اور پانڈیا سے منسلک ہو جاتا ہے جنہوں نے جنوبی ہند کی تاریخ کی تخلیق اپنے مضبوط ہاتھوں سے کی تھی۔ کچھ مؤرخوں کا خیال ہے کہ کیرل قدیم چیر بادشاہت کا ایک حصّہ تھا جس کی طاقت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بعد ازاں کیرل آزاد بھی ہو گیا تھا۔"

شاعر کی توجہ سنتریوں کی طرح کھڑے ہوئے ناریلوں کی طرف تھی۔ ڈراما آرٹسٹ نے افسانہ نگار کی بات کاٹ کر کہا "بھئی اب افسانہ ختم بھی کرو۔ میں سمجھتا ہوں کیرل کا جنم کیرم سے ہوا ہے — کیرم یعنی ناریل۔ اور کیرل یعنی ناریلوں کا دیس — ان گنت ناریلوں کا دیس۔ ٹراونکور سٹیٹ، کوچین سٹیٹ اور برٹش مالابار، یہی ہمارا پیارا کیرل پرانت ہے۔ اس میں ہماری ٹراونکور کی لمبائی پونے دو سو میل ہے — کنیا کماری سے ارنا کُلم تک۔ کوئی ایک کروڑ لوگ ملیالم زبان بولتے ہیں اور میرا خیال ہے مستقبل کے آزاد ہندوستان میں ملیالم بولنے والوں کا اپنا پرانت کیرل روس کی آزاد سوویٹوں کی طرح جنتا کی حکومت کے بل بوتے پر ایک نئی دُنیا کی بنیاد رکھے گا۔ نیا ڈراما، نیا افسانہ، نئی شاعری، نئی مصوری۔ ہم اپنے قدیم ورثے پر بجا فخر کریں گے اور نئے نظام کے نئے تمدن کی تخلیق ہمارا آدرش ہو گا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دُنیا اور فن شروع بھی ہو چکا ہے۔"

میں نے کہا "جب سب کچھ نیا ہو رہا ہے تو کیرل کے لوک گیت بھی تو نئے ہو کر رہیں گے نا؟"

اب شاعر کبھی خیر حاضر نہ رہ سکا۔ بولا "نئے لوک گیت؟ جی ہاں۔ نئے گیت تو ہمیشہ جنم لیتے رہتے ہیں۔"

پانیوں پر روشنی جھلملا رہی تھی۔ شاعر سگریٹ پی رہا تھا اور دھوئیں کے ننھے ننھے بادل میرے قریب سے ہو کر گزر رہے تھے۔ شاید ان دھوئیں کے بادلوں میں شاعر اپنی کسی نظم کے لئے کوئی نئی تشبیہ ڈھونڈ رہا تھا۔ دونوں ملاحوں کی طرف میں نے غور سے دیکھا اُن کے ہونٹ دھیرے دھیرے سُرخ ہوتے نظر آتے تھے جیسے بیر بہوٹیاں رینگ رہی ہوں۔ وہ بھی کسی نئے لوک گیت کو جنم دینے کے خیال سے نئے آدمی ہوئے اٹھے تھے، کم از کم مجھے تو یہی خیال آ رہا تھا۔ جگنو الگ اپنی آنکھ مچولیوں میں مگن تھے۔ افسانہ نگار بولا "مجھے تو یہ جگنو بھی نئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق میں ایک افسانہ لکھوں گا۔"

ڈراماسٹ اور مصور اپنے قہقہوں کو نہ روک سکے۔ بولے "ارے بھئی جگنو تو ہمیشہ نئے تھے اور ہمیشہ نئے رہیں گے۔"

میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ بیر بہوٹیاں بھی ہمیشہ لال تھیں اور ہمیشہ لال رہیں گی۔ ملاحوں کے ہونٹ اب اور بھی لال ہو اُٹھے تھے۔ مجھے تو یہی دکھائی دیتا تھا کہ بیر بہوٹیوں نے بڑے اطمینان سے اِن ہونٹوں کے اُوپر دو ننھی قوموں کا روپ دھار لیا ہے۔ شاعر چپ تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ بیر بہوٹیاں اُسے بھی نظر آ رہی ہوں گی اور وہ ضرور اُنہیں اپنی کسی نظم میں جگہ دے گا۔

چاند ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ ہمیں پانیوں کی لذت اندوزی کی طرف راغب کرنا چاہتا تھا۔ اپنے چاروں طرف زندگی کا خلا تو تھا ہی لیکن روشنی کی پتلی پتلی باہنوں نے گھرتے گھرتے سایوں کو یوں بھینچ رکھا تھا جیسے انسانیت بے پناہ حیوانیت کو اپنے قریب لانے

کی کوشش کر رہی ہو۔ ناریل کے پیڑ ختم نہ ہو سکتے تھے۔ مجھے اُن کے سایوں سے ہمکنار نقش بہت بھلے دکھائی دیتے تھے۔ یہ ان لمبے لمبے پانیوں کا سنگار تھے۔ میرے ذہن میں جیسے کوئی نغمہ جاگ رہا ہو۔ "کیرل دیش ہمارا، کیرل پیارا پرانت ہمارا! کیرل ان گنت ناریلوں کا دیس! کیرل لمبے لمبے پانیوں کا دیس! کیرل روشنیوں اور سایوں کا دیس" گھڑی کی مسلسل ٹِک ٹِک کی طرح یہ الفاظ میرے ذہن میں گونج رہے تھے۔

میں سوچنے لگا جیسے ننھے ننھے کیڑے سُرمے کی طرح باریک مٹی پر رینگ رینگ کر عجیب عجیب نقش چھوڑ جاتے ہیں، اسی طرح پرانے لوک گیتوں کے سُر ان ملاحوں پر اپنے نقش چھوڑ جاتے ہونگے مگر اب تک انہوں نے کچھ نہ گایا تھا۔ شاعر سے کہہ کر میں نے انہیں کہلوایا بھی، وہ گانے پر رضامند نہ ہوئے۔ اُلٹا اُن کے قہقہے ہتھوڑے کی طرح ہٹ کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ہماری بدیسی زبان نے انہیں ہم سے اور بھی دور کر دیا تھا، اور اب وہ کسی قیمت پر ہم سے صلح کرنے پر تیار نہ تھے۔

پھر میرے اصرار پر شاعر نے ایک لوک گیت چھیڑ دیا۔ "یہ ملیالم گیت بہت پرانا ہے،" افسانہ نگار نے دھیرے سے میرے کان میں کہہ دیا۔ چمکیلے پانیوں پر لہریں اُٹھ رہی ہوں جیسے یا جگنوؤں کی آنکھ مچولیاں تیز تر ہو گئی ہوں دیکھتے ہی دیکھتے! یا بیر بہوٹیوں کی قطاریں ہونٹوں کے علاوہ دل و دماغ پر بھی رنگ چڑھا رہی ہوں جیسے میرا ذہن جلدی جلدی یہ سب کچھ محسوس کر رہا تھا۔

نغمہ ختم ہو چکا تھا۔ اب گویا میرے سامنے ایک دُلہن بیٹھی تھی — ایک پنجابی دُلہن جس کی ناک کی سیدھ لگی ہوئی مانگ پر سیندور بھر دیا گیا ہو (شاید یہ سیندور نہ تھا) اس مانگ پر بیر بہوٹیوں نے قطار بنا رکھی تھی۔ گیت کے الفاظ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے

میں نہ جانے کیا سے کیا سوچ رہا تھا۔ اُس دُلہن کی چوڑیوں کی جھنکار سی پھر ذہن میں گونجنے لگی اور پھر جب پتہ چلا کہ یہ گیت تو ایک سانپن کے متعلق ہے اور جگنوؤں، بیربہوٹیوں سیندور سے بھری مانگ یا چوڑیوں کی جھنکار سے اس کا دُور کا بھی رشتہ نہیں تو گویا چاند بھی میرا مُنہ چڑانے لگا، تارے بھی مجھے گھُورنے لگے ہوا بھی ایک طنز کی طرح چُبھنے لگی۔ ترجمہ کیے جانے پر گیت یُوں سامنے آیا:

"اجی تم کِدھر سے چلی آتی ہو کالی سانپن؟
"میں تو اب انڈے دے کر جا رہی ہوں۔
"کالی اماں! تمھیں ذرا بھی تو دیا نہیں آتی۔
"اَن گنت انڈے دے ڈالے ہیں تم نے
"اِن انڈوں سے سب سینکڑوں ہزاروں بچے نکل آئیں گے۔
"باپ رے! اِن انڈوں سے اتنے سپولیے نکل آنے پر
"اِن اوتی آدمیوں کو بھلا کہاں اپنا نصیب ہوگی!"

ایک سپیرے نے ایک بار اپنی معلومات کا خزانہ لٹاتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ انڈے دینے کے بعد سانپن اُن کے گرد ایک گول دائرہ کھینچ کر چلی جاتی ہے اور واپس آکر اس دائرے کے اندر رینگنے والے سپولیوں کو کھا لیتی ہے، صرف وہی سپولیے سانپ بنتے ہیں جو خوش قسمتی سے اس دائرے سے باہر نکل جاتے ہیں۔ اُس کا خیال تھا کہ ہر سانپن بہت حد تک آدمی کی دوستی کا دم بھرتی ہے ورنہ اگر اس کے سب سپولیے زندہ رہیں تو سچ مچ آدمی کو کہیں ڈھونڈے سے بھی بچاؤ کی صورت نظر نہ آئے۔ کبھی کبھی ناگن اپنے انڈے کھائے ۔۔۔ شمالی ہندوستان کی یہ کہاوت ایسے ہی تجربے پر مبنی تھی۔

لیکن ایک پنجابی سپیرے کا خیال تھا کہ انڈوں کے گرد گھیرا ڈال کر ناگن کہیں چلی نہیں جاتی، بلکہ انڈوں کے گرد وہ کنڈلی مار کر بیٹھی رہتی ہے اور جوں جوں بھوک لگتی ہے وہ اپنے انڈے کھاتی جاتی ہے۔

شاعر کہہ رہا تھا: "سانپن کے ایک ایک انڈے سے کئی کئی سپولئے نکلتے ہیں۔"

افسانہ نگار بولا: "میں ایک افسانہ لکھوں گا جس کے پس منظر میں ان گنت سانپنیں اَن گنت انڈے دے رہی ہوں گی اور ان میں سے ان گنت سپولئے نکل نکل کر پل رہے ہوں گے۔ سانپنیں اپنے انڈے یا سپولئے خود نہیں کھائیں گی۔ سانپوں اور آدمیوں میں وہ جنگ ہو گی کہ رہے خدا کا نام!"

ڈراما آرٹسٹ بولا: "تو میں کہوں گا کہ یہ میری نقل ہے۔ میری ایک تمثیل اسی خیال کے گرد گھومتی ہے اور وہ چھ ماہ ہوئے شائع بھی ہو چکی ہے۔"

مصوّر بولا: "میں تو تصویروں کی دنیا کا باشندہ ہوں۔ مگر کچھ نہ کچھ میں بھی پڑھتا رہتا ہوں۔ اگر میری تصویر کو نقل سے منسوب نہ کیا جائے تو میں بھی گھر پہنچ کر ایک تصویر بناؤں جس میں لوک گیت کی سانپن کے روبرو دھرتی کا ادنیٰ انسان اپنی مصیبتوں کا افسانہ بیان کر رہا ہو۔"

"ضرور ضرور!" ہم سب یک زبان ہو کر بولے۔

ملّاح باپ بیٹا خوش نظر آتے تھے۔ سانپن کا گیت انہوں نے بھی مزے سے سنا تھا۔ ہم ساتوں آدمیوں میں ایک معنی خیز ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی ——— مالابار کے پانیوں پر!

خانہ بدوشوں کے ساتھ

میں خانہ بدوشوں سے بارہا ملا ہوں صبح کی پہلی سنہری روشنی میں اور شام کے پل پل چھن چھن بڑھتے رومانی سایوں میں، گرد و غبار سے بھری ہوئی فضاؤں میں اور صاف آسمان کے نیچے صاف ماحول میں۔ خانہ بدوشوں کے ساتھ میں نے سفر بھی کیا ہے، اُن کے اُٹھاؤ چولہوں پر پکا ہوا کھانا بھی کھایا ہے۔ اُن میں زیادہ غریب بھی تھے اور کم غریب بھی، نرے جاہل بھی اور بات بات میں موتی پرونے والے بھی۔ اُن کے چھوٹے بڑے جھگڑے بھی دلچسپ تھے اور دوستی کے قہقہے بھی۔ اُن کے گیت اور ناچ اور فسانے اُن کی آزاد زندگی کے امانت دار تھے۔

مجھے گوری کا سانو یاد ہے جس کی سرخ زمین پر کاڑھے پھول اُس نے اپنے ہاتھ سے کاڑھے تھے۔ چونکہ دیئے کے گرد دستی ہرنی کا جھومر ناچنے میں اُس نے بہت نام پایا تھا۔ وہ کوئی راجپوت دلہن معلوم ہوتی تھی۔ اُسے دیکھ کر مجھے اس خانہ بدوش گوری کا دھیان آیا

آجاتا جس کے عشق میں پھنس کر ایک بادشاہ نے ہمیشہ کے لئے ملک گیری ترک کر دی تھی۔ خود گوری کو بھی یہ کہانی یاد تھی۔ ایک تھا راجہ جو شادی نہیں کرتا تھا۔ سلطنت کے لئے وارث کہاں سے آئے گا، وزیروں کو ہمیشہ یہ فکر دامنگیر رہتی۔ وہ نئی سے نئی حسینہ کا پتہ نکالتے مگر راجہ انکار کر دیتا۔ امیر وزیر مایوس ہو گئے۔ ایک دن راجہ نے بھرے دربار میں سب وزیروں کو اپنے نئے ارادے سے آگاہ کیا۔ برس بھر وہ سلطنت کے کام سے چھٹی لے کر باہر گھومے گا اور واپس آنے پر وزیروں کی رائے کے مطابق شادی کرے گا۔ وزیروں نے راجہ کی بات بہت پسند کی۔ راجہ چلا گیا۔ راستے میں اُس نے اپنی شاہی پوشاک ایک ندی میں پھینک دی اور گھومتے گھامتے وہ ایک خانہ بدوش قبیلے میں شامل ہو گیا۔ راجہ کے چہرے پر شرافت اور معصومیت جھلکتی تھی۔ خانہ بدوشوں کو اُس کی نیت پر شک نہ ہُوا۔ اِس قبیلے میں ایک دوشیزہ تھی جس کا دِل صحرا کی طرح وسیع تھا۔ راجہ نے اُس کی آزاد آنکھوں میں شعریت کی دولت دیکھ لی۔ اُس کے نغموں سے وہ بےحد متاثر ہُوا۔ دِن گزرتے گئے۔ راجہ کو کئی بار اپنی سلطنت کا دھیان آتا مگر اس دوشیزہ کی محبت ابھی کچھ کم نہ تھی۔ وہ اپنے دِل کو تسلّی دے لیتا کہ ابھی سال ختم ہونے میں دیر ہے۔ پھر جب بارہ مہینے ختم ہونے کو آئے راجہ نے خانہ بدوشوں سے درخواست کی کہ وہ اُس کے مُلک کی طرف چل پڑیں۔ چند روز بعد سب لوگ راجہ کے مُلک کی سرحد پر جا پہنچے۔ راجہ کو یُوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی اُسے زبردستی اُٹھائے لئے جا رہا ہے۔ خانہ بدوش گوری سے اُس نے اپنے ساتھ چلنے کی التجا کی۔ وہ بولی "وہاں تو مَیں پنجرے میں قَید ہو کر رہ جاؤں گی۔ یہ آزاد ہوائیں، یہ کھلی فضائیں وہاں کہاں ملیں گی؟" آخر راجہ نے اِن لوگوں کو اِس بات پر رضامند کر لیا کہ وُہ دو دن اسی سرحد پر قیام کریں۔ راجہ راجدھانی میں پہنچ کر دو راج پاٹ

سنبھالے گا اور دو دِن بعد واپس آ کر اُنہیں الوداع کہے گا تو وہ جہاں چاہیں گے جا سکیں گے۔ اس ایک برس کے عرصے میں راجہ کا بھیس کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ چہرے پر داڑھی اُگ آئی تھی۔ کوئی اُسے پہچان نہ سکتا تھا۔ محل کے دروازے پہ پہریدار کھڑے تھے۔ راجہ بولا "یہاں کس کا راج ہے؟" جواب ملا "ہمارا راجہ کہیں یاترا کو گیا تھا۔ ناری سے اُس کے کپڑے ملے۔ اس کے بعد اُس کی کوئی خبر نہیں آئی۔ معلوم ہوتا ہے اُسے کسی نے قتل کر دیا۔ تین ماہ سے اُس کا بھائی راج کر رہا ہے۔ راجہ یہ سُن کر واپس لوٹ آیا۔ اُس کے قدم تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کی لہریں تھرک رہی تھیں، دِل میں گدگدی ہو رہی تھی۔ دُور سے خانہ بدوش گوری نے اُسے آتے دیکھا تو وہ کہہ اُٹھی: "آخر میرا محبوب آ ہی گیا۔ وہ اب میرے پاس ٹھہرے گا۔ میرا راجہ، میرا ہرن!" ..... گوری کی سبز انگیا اور سبز گھگھری پر لال ساڑی بہت خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ یقیناً اُسے رنگوں کی موسیقی کا پورا پورا علم تھا۔

مجھے گوری کا وہ گیت یاد ہے جس میں دولہا دُلہن کے گھونگھٹ کی تعریف کئے جاتا ہے:

"بنڑی تھارے گھونگھٹڑے رے کارنے ـــــ دُلہن! تیرے گھونگھٹ کی خاطر

کجلی دیس را گھوڑلا میں تو لیایا ـــــ میں کجلی دیس کا گھوڑا لایا ہوں

تھاری رجوڑ گھونگھٹیئے ہیراں جڑیو ـــــ میری رانی! تیرے گھونگھٹ میں ہیرے جڑے ہیں

ہیراں جڑیو موتیڑاں جڑیو ـــــ ہیرے جڑے ہیں موتی جڑے ہیں

تھارے گھونگھٹیا میں سولے سورج اُوگیا ـــــ تیرے گھونگھٹ میں سولہ سورج طلوع ہو گئے

تھاری رجوڑ گھونگھٹیئے ہیراں جڑیو!" ـــــ میری رانی! تیرے گھونگھٹ میں ہیرے جڑے ہیں۔

ایک اور گیت تھا جس میں دولہا اور دُلہن کی بات چیت درج ہے۔ یہ گیت گوری

کے خاوند دھن سنگھ کو بھی پسند تھا:

"ایک ور کرلا تھارا، مارُوجی! پاچھا جی موڑ
راجین! ڈھولا، اولُوں گھنی آوے ہمارا بابُو ساری
سُندر گوری، اولوں تھاری پری رے نِوار
چمپک ورنی! بابُو ساری اولُوں سسرو جی بھانگسی"

— ایک بار اپنا اونٹ پیچھے موڑ لو، مارُوجی!
راجن ڈھولا! مجھے اپنے باپ کی بہت یاد آتی ہے
سُندر گوری! تم باپ کی یاد کو چھوڑ دو
چمپا کی ہم رنگ دُلھن! باپ کی یاد کو تمہارا سُسر دُور کر دیگا

"ایک ور او مارُوجی کرلا جی پاچھا موڑ
راجین! ڈھولا اولُوں گھنی آوے ہماری مائے ری
سُندر گوری اولُوں تھاری پری رے نِوار
مرگا نینی! مائُجی ری اولُوں سا سوجی بھانگسی"

— ایک بار اپنا اُونٹ پیچھے موڑ لو، مارُوجی!
راجن ڈھولا! مجھے ماں کی یاد بہت آتی ہے۔
سُندر گوری! تم ماں کی یاد کو چھوڑ دو
ہرنی جیسی آنکھوں والی دُلھن! ماں کی یاد کو ساس دُور کر دیگی

"ایک ور او مارُوجی، کرلا جی پاچھا موڑ
راجین! ڈھولا، اولُوں گھنی آوے ہمارے ویر ری
سُندر گوری، اولُوں تھاری پری رے نِوار
چمپک ورنی! ویرے جی ری اولُوں دیور بھانگسی"

— ایک بار اپنا اونٹ پیچھے کو موڑ لو، مارُوجی!
راجن ڈھولا! مجھے بھائی کی یاد بہت آتی ہے
سُندر گوری! تم بھائی کی یاد کو چھوڑ دو
چمپا کی ہم رنگ دُلہن! بھائی کی یاد کو دیور دُور کرے گا۔

"ایک ور او مارُوجی کرلا جی پاچھا موڑ
راجین! ڈھولا! اولُوں گھنی آوے ہماری بہین ری
سُندر گوری، اولوں تھاری پری رے نِوار

— ایک بار اپنا اُونٹ پیچھے کو موڑ لو، مارُوجی!
راجن ڈھولا! مجھے بہن کی یاد آ رہی ہے
سُندر گوری! اپنی بہن کی یاد کو چھوڑ دو

مرگا نینی! او ینڈی دی اوڈوں تن دل بھانگسی" ——— ہرنی جیسی آنکھوں والی دُلہن! ابن کی یاد کو تو دُور کر دیگی

ستلج کے کنارے خانہ بدوشوں نے پورا گاؤں بسا رکھا تھا۔ یہ لوگ یقیناً بگڑی ہوئی راجستھانی بولتے تھے۔ اُن کے گیت ابھی خالص راجستھانی میں تھے۔ کسی زمانے میں وہ راجپوتانہ سے نکل پڑے تھے۔ ان کی بیل گاڑیاں اُن کے ساتھ رہتی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے ہر کوئی اپنی اپنی گاڑی پر سامان لاد کر چل پڑتا۔ گاڑیوں کی وجہ سے لوگوں نے انہیں "گڈیاں والے" کہنا شروع کر دیا تھا۔ چار پانچ خاندان بھیلوں کے معلوم ہوتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ گوری کی ماں بھی بھیلنی تھی۔

ان لوگوں میں بہت اتفاق نظر آتا تھا اور ان پر پرانی کہاوت صادق آتی تھی ——— خانہ بدوش کے دس ٹکڑے کر ڈالو وہ مرے گا نہیں، ایک دن خانہ بدوش بن جائیں گے!

مجھے امرتی کے قہقہے یاد ہیں۔ اُس کے دو بھائی تھے جو دن بھر لوہے کے کھرپے تیار کرتے رہتے۔ امرتی اپنی ماں کے ساتھ انہیں بیچنے نکلتی۔ باپ مر چکا تھا۔ امرتی کے جنم سے دو ماہ پیشتر ہی وہ ہیضہ کے کارن چل بسا۔ اُس کی ماں میرے روبرو یہ قہقہہ شروع کر دیتی تو روئے بغیر نہ رہ سکتی۔ لیکن امرتی کے قہقہے ماں کے آنسوؤں سے کبھی نہ بھیگتے۔ رات کو چومکھے دیے کے گرد ناچتے ناچتے امرتی بیکانیر کا گیت چھیڑ دیتی جس میں نہایت خوبصورتی سے دیے کی لو کو مخاطب کیا گیا تھا:

"بیکانے مت دے ئے رے ماراو بابل، سامر لو، اے لوئے ——— بیکانیر میں سُسرال مت دینا اے باجی! اے دیے کی لو!

سامر لو، اے لوئے! ——— سُسرال ——— اے دیے کی لو!

بیکانے رو پانی بوہ دُور، سامر لو، اے لوئے!" ——— بیکانیر کا پانی بہت دُور ہے ——— سُسرال ——— اے دیے کی لو!

"لیاوت گھس گی بائی ری پگ بھلی، رے لوٹے! — پانی ڈھوتے ڈھوتے بائی کے تلوے گھس گئے، اے دیئے کی لو!
پگ بھلی، رے لوٹے! — تلوے — اے دیے کی لو!
اینڈھونی سین گھس گیا بائی را کیس رے ماں! — اینڈری رکھتے رکھتے بائی کے کیس گھس گئے، اے ماں!
اینڈھونی سین گھس گیا بائی را کیس رے لوٹے!" — اینڈری رکھتے رکھتے بائی کے کیس گھس گئے، اے دیئے کی لو!

"گھونگھٹیے سیں گھس گی بائی ری چونڑی اے لوٹے! — گھونگھٹ نکالتے نکالتے بائی کی چنری گھس گئی، اے دیئے کی لو!
چونڑی اے لوٹے! — چنری — اے دیئے کی لو!
آتاں جاتاں ٹوٹی پگلیاں ری موجڑی، رے ماں! — آتے جاتے پاؤں کی جوتی ٹوٹ گئی، اے ماں!
آتاں جاتاں ٹوٹی پگلیاں ری موجڑی، رے لوٹے!" — آتے جاتے پاؤں کی جوتی ٹوٹ گئی، اے دیئے کی لو!

امرتی کو ماضی کی فکر تھی نہ مستقبل کی پروا، اس کے لئے جھومر شراب کا کام دیتا۔ جو تکھے دیئے کے گرد ناچتے ناچتے اس کے دل و جان کی اہمیت اجاگر ہو جاتی۔ یہ جو مکھا ہمیشہ جلتا رہے اور وہ ناچتی رہے، وہ سوچتی، اچھا ہے کہ وہ رقاصہ بھی ہے اور مغنیہ بھی۔ ستلج کی لہریں تال دیتے جاتیں۔ یوں معلوم ہوتا کہ ساری دھرتی انگڑائیاں لے رہی ہے۔
عالم خیال میں میں بیکانیر کے ایک ایک کوئیں میں جھانک جھانک کر دیکھتا۔ سچ مچ ان کنوؤں کا پانی بہت گہرا تھا۔

کوئی ایک ماہ سے میں ان لوگوں کے ساتھ منسلک ہو گیا تھا۔ اس عرصے میں ہم تین چار پڑاؤ طے کر آئے تھے۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اینٹوں کی دیواروں میں قید ہونا پسند کرے۔ پانی کی طرح بہنا، ہوا کی طرح چلنا، بس یہی ہر کسی کو پیارا تھا۔ بہتے رہنا، چلتے رہنا۔ اپنے لئے پکی اینٹوں کے گھر کو وہ تصور میں بھی نہ لاتے تھے۔ کچھ خاندان ایسے بھی تھے جو گھر

وغیرہ تیار کرنے اور انہیں فروخت کر کے نفع حاصل کرنے کی کچھ ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ اُن کے بچے پاس کی بستی سے بھیک مانگ لانے میں شرمندگی اُنہیں چھو تک نہ گئی تھی۔ وہ آزاد فضاؤں کے بیٹے تھے۔

جھریوں والی کچھ پیشانیاں مجھے یاد ہیں۔ اُن کی بولی میں اُن سے گفتگو کیجئے تو اُن کی جھریاں اور بھی نمایاں ہو جاتیں۔ میری خانہ بدوشی کی کہانیاں اُن کے لئے خالی از دلچسپی نہ تھیں۔ بھکاری بھی مہمان نواز ہو سکتے ہیں، یہ بات میں نے پہلی بار اسی قبیلے میں محسوس کی تھی۔ اُن کی محبت میرے لئے کسی رحمت سے کم نہ تھی۔

ہم چلے جا رہے تھے۔ میں گوبی کی گاڑی پر بیٹھا تھا۔ وہی سبز انگیا اور سبز گھگری اور وہی کالا پھولوں والا لال سالو سر پر۔ آنکھوں میں کاجل، پاؤں میں چاندی کی پائل کوئی بیس گاڑیاں آگے آگے جا رہی تھیں اور گیارہ گاڑیاں پیچھے پیچھے آ رہی تھیں دھن سنگھ کے ہاتھ میں بنسری تھی۔ ابھی وہ بیلوں کو گالیاں دے رہا ہے، ابھی بنسری پر کوئی نغمہ چھیڑ دیتا ہے۔ ابھی پیچھے مڑ کر ہماری طرف دیکھتا ہے۔ اُس کی آنکھوں کی چمک، اُس کی گالیاں جو بیلوں کی سمجھ سے پرے تھیں، اُس کا نغمہ جو مہذب دنیا کی اشتہاری موسیقی سے بالکل الگ معلوم ہوتا تھا، سب مجھے یاد ہے۔

اُس گاڑی پر بیٹھے بیٹھے یورپ کے خانہ بدوش قبیلوں کی کہانی میرے سامنے زندہ ہو اُٹھی۔ وہ سب ہندوستانی تھے اور کسی زمانے میں اُن دور دراز ملکوں میں جا نکلے تھے۔ آج تک خالص راجستھانی کے بہت سے الفاظ تھوڑی بہت بگڑی ہوئی صورت میں اُن کی زبان میں موجود ہیں، جیسا کہ محققین کی تحقیق سے معلوم ہوتا تھا۔

بڈھا کلّو جو ہماری گاڑی سے پچھلی گاڑی میں بیٹھا تھا، اپنا اکتارا چھیڑ رہا

تھا اور سہم سے۔ اگلی گاڑی میں ایک بچہ دودھ کیلئے رو رہا تھا۔ میری روح کو عجب کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ مَیں چاہتا تھا امرتی کی گاڑی پر جا بیٹھوں۔

گوبری کی نگاہ اُن ساٹھ ستّر رسّوں پر تھی جو دھن سنگھ نے بہت محنت سے تیار کئے تھے، اور جنہیں بیچ کر وہ اگلے پڑاؤ پر رسوئی کا سامان خرید سکتی تھی۔

گاڑیاں چلی جا رہی تھیں۔ فضا شور سے بوجھل تھی، جیسے لاکھوں شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ پھر یہ شور دبتا چلا گیا اور مَیں ایک سپنے میں کھو گیا.....

امرتی کہہ رہی تھی: "بیکانیر کے کنوئیں بہت گہرے ہیں۔" مَیں نے کہا: "تمہارے لئے ہیں نے بیکانیر کی حکومت چھوڑ دی، تمہارا دِل تو صحرا کی طرح وسیع ہے امرتی!" چونکھا روشن ہو اُٹھا۔ پائل بولی —— "جھومر کی جے" مَیں نے کہا: "خانہ بدوش شہزادی کی جے جس کے گھونگھٹ میں سوا چندرما جگمگا رہے ہیں۔ ناچو، امرتی ناچو"...... شاید مَیں ہمیشہ سے اِس کبھی نہ ختم ہونے والی سڑک پر سفر کرتا آیا تھا —— خانہ بدوشوں کے ساتھ ساتھ ⬥

شانتی نکیتن

مَیں 'پانتھ' جو ہوں — دُور دُور کا راہی۔ شاید اسی لئے یہ پانتھ نواس مجھے اتنا پسند ہے۔ یہ سڑک جس کے کنارے یہ مکان کھڑا ہے، پچھم کی طرف سنتھالوں کے دیہات سے جا ملی ہے۔

'ہنسے جاؤ، سنتھال چھوکریو، تمہاری ہنسی میں تو دھرتی کھلکھلاتی ہے'۔

صبح ہوتے ہی سنتھال عورتیں گاؤں سے نکل پڑتی ہیں اور پانتھ نواس کے سامنے سے گزرتی ہوئی اپنے اپنے کام پر چلی جاتی ہیں۔ بھوک ہے، صدیوں کی غریبی ہے اور بڑی کٹھن مزدوری میں زندگی بسر ہوتی ہے۔ مگر روزانہ زندگی کی تلخ حقیقتیں اُن کی ہنسی پر چھاپا نہیں مار سکیں۔ شام کو اسی سڑک سے وہ واپس آتی ہیں، دن بھر کی محنت سے تھک کر۔

شہر اور گاؤں تو مَیں نے بہت چھان مارے ہیں۔ لوگ بھی مَیں نے بہت دیکھے بھالے ہیں۔ بار بار میرا منہ پانتھ نواس کی طرف گھوم جاتا ہے۔ جب مَیں یہاں آتا ہوں، اسی کونے

والے کمرے میں ٹھہرتا ہوں۔ بارہ سال سے میں اسے جانتا ہوں۔ اب یہ میرا گھر ہے۔

اپنی کھڑکی سے جو سڑک کی طرف کھلتی ہے۔ اُس چھدری چھاؤں والے درخت کی طرف دیکھتا رہتا ہوں جس کے نیچے چوکڑی بھولے ہوئے ہرن کی طرح کوئی سنتھال آ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ بنسری پر اپنا نغمہ چھیڑتا ہے۔ صدیوں سے یہ بنسری جاگتی رہی ہے۔ صدیوں سے یہ نغمہ جاری ہے:۔

کیا ہیں آخر ہم سب مِل کر؟
ہم سب مِل کر۔
اَن گِنت درختوں کا اِک جھُرمٹ!
ڈھول بڑا ئے دِنتوں کے
لچک لچک جاتی ہیں کمریں
بازو کالے چمکیلے
تھُنیں جیسے کنول ہوا کے
ہلکے نرم تھپیڑوں سے
کیا ہیں آخر ہم سب مِل کر؟
ہم سب مِل کر۔
اَن گِنت درختوں کا اِک جھُرمٹ!

یہ جذبات، جو پہلی بار اِدھر آنے پر سنتھالوں کے ایک قدیم گیت میں مجھے مِل گئے تھے، میرے ذہن میں ناچ اُٹھتے ہیں۔ یہ کیا نغمہ ہے۔ بنسری والے کی آنکھوں میں خودداری جھلکتی ہے۔

یہ جا، وہ جا، وہ دُور نکل جاتا ہے، دُور سے نغمہ کی آواز سنتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وُوری زندگی میں بدل رہی ہے۔ سوچتا ہوں کہ سنتھال نہ ہوتے تو شانتی نکیتن کے پس منظر کی بہت ساری سُندرتا پھیکی پڑ جاتی۔

اِدھر یہ لوگ کب آئے؟

اٹھارھویں صدی کے آخری دِنوں میں۔

سنتھال پرگنہ (بہار) میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے کھیت بانجھ رہ گئے تھے۔ کال سے بچنے کے لئے کچھ لوگ اِدھر آنکلے۔ ہوشیار زمینداروں کی چاندی ہو گئی۔ معمولی مزدوری پر وہ اُن سے اپنی پتھریلی زمین کو کھیتی کے قابل بنواتے چلے گئے۔ اب بھی یہ لوگ انتھک محنت کرتے ہیں۔ صبح کی روشنی میں اُنہیں اپنی کھڑکی سے دیکھتا ہوں تو چاہتا ہوں کہ ایک ایک سنتھال سے پوچھوں کہ رات کو بھر پیٹ کھانے کو مِل گیا تھا یا نہیں اور صبح کا ناشتہ کتنا مزیدار رہا۔

"..... سب کے سب سنتھال اپنا مُنہ کُھلا رکھ کر ہی چلتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی کے سفر میں اُنہیں بار بار ہار ہوئی ہے، اور زندگی کی مڈبھیڑ کے لئے اُن کا علم اور تجربہ ناکافی رہا ہے..... لطیف ہنسی مذاق نہ دیکھ پاتا تو ان کو دبی ہوئی قوم ہی بتاتا۔ اگر ان لوگوں کو کسی خاص چیز نے بچایا ہے تو وہ ہے ان کے سنگیت اور اِن کے ناچ میں ظاہر ہونے والے آنند نے۔ جاپانیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ چاہے کتنی آفت، تکلیف، بے عزتی اور شکست کیوں نہ آ پڑے، جاپانی ہنستا ہی رہے گا۔ یہ کوئی بناوٹی انداز نہیں۔ حالات کتنے کڑے ہوں، جاپانی اپنی خود اعتمادی کو کھوتا ہی نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ اُس کی شخصیت حالات سے بڑھ چڑھ کر ہے اور موقع پاتے ہی حالات پر قابو پا لینے کی ہمت

اُمن ہیں ہے۔ یہ سنتھال بھی ویسی ہی خود اعتمادی رکھتے ہیں۔ ممکن ہے یہ خود اعتمادی نہ ہو، بلکہ حالات کی لاعلمی ہو جو اکثر بچوں میں پائی جاتی ہے...... یہ لاعلمی یوں حفاظت کے لیئے حاضر نہ ہوتی۔ تو ہم بچے کبھی بڑے نہ ہو پاتے اور وسیع آسمان کا پھیلاؤ دیکھ کر یہ لوگ تصور کے بوجھ تلے ہی دب جاتے..... اگر ہم جینا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے جیسا بنا کر اپنے ساتھ لیئے بنا چل نہیں سکتے......[1]

ہنسے جاؤ کھلکھلا کر، بھولے سنتھالو! بجائے جاؤ بنسری۔ گائے جاؤ نغمے پرانے، مگر زندگی نے لڑنا ہوگا اپنے بل پر۔ دب کر نہ رہ جانا۔ کون کھاتا ہے ترس کسی پر؟ خود لڑنا ہوتا ہے دور اندیشی کے بل پر۔

چھدری چھاؤں والے درخت کے نیچے ایک بوڑھا سنتھال آ بیٹھا ہے۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ اُس کے پاس جا بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ اب تو سندرم بھی اُس کے پاس آ بیٹھا ہے، وہ اِس بوڑھے کا پنسل سکیچ بنانے آیا ہوگا۔ میں بھی دیکھوں چل کر۔

بوڑھا مسکرا رہا ہے، سندرم بھی اور میں بھی۔

کتنے بھولے لوگ ہیں یہ سنتھال۔

جی ہاں!

کتنے بھولے لوگ ہیں یہ سنتھال! ایسا کہنے میں سندرم کا فائدہ ہے۔ پر وہ خود کیوں بھولا بننا پسند نہیں کرتا؟ یہی آدمی یوں اپنا سکیچ نہ بنانے دے اور اپنے وقت کی قیمت مانگنا سیکھ لے تو سندرم کو ہوش آ جائے۔ جنوبی ہند کا یہ سندرم آخر کیسا دنیادار نکلتا ہے۔ مصور بن کر وہ پیسے کمائے گا اور بہت ممکن ہے یہی سکیچ جو وہ اس وقت تیار کر رہا ہے پانچ

۱۔ کالا کا پیکر۔ وشال بھارت، فروری ۱۹۳۵ء

سات آنے میں کسی ٹورسٹ کے ہاتھ بیچ ڈالے . . . . مگر اس سے بوڑھے کو کیا فائدہ۔ اُسے اگر اس وقت دو رس گُلّے ہی کھلا دیئے جائیں تو وہ سُندرم کی طرف احسان مندانہ نگاہ سے دیکھنے لگے۔

ایک انگریز ٹورسٹ کہہ رہا ہے "سنتال بہٹ اچھا ڈگ ہے۔"

میں سوچتا ہوں، کاش ہم سب اتنے اچھے ہوتے۔ اب اگر میں یہ بات کُھلم کُھلا اِس ٹورسٹ کو کہہ دوں تو وہ شاید جھلا کر کہہ اُٹھے "آم تو سنتال نائیں بن سکتا۔"[1]

کل سُندرم نے ایک سنتھال چھوکری کا سکیچ بنایا تھا۔ پنسل چلاتے چلاتے وہ کہہ رہا تھا سُندرتا کیا صرف رنگ تک محدود ہوتی ہے؟ گورے رنگ اور تیکھی نوک پلک سے پرے بھی سُندرتا کی سرحدیں پھیلتی چلی گئی ہیں۔

اُس وقت میں یہ سوچ رہا تھا۔ کاش سُندرم نے یہی بات سنتھالی زبان میں یا سادہ بنگالی میں کہی ہوتی اور وہ چھوکری اپنی سُندرتا کی تعریف سُن کر سمجھتی کہ اُسے اُس کے وقت کا معاوضہ مل گیا ہے۔ اور یہ سوچ کر کہ شاید اس کے جوڑے کا لال پھول نیچے کو ڈھلک گیا ہے، وہ اُسے ٹھیک کرنے لگ جاتی۔ مگر وہ تو بُت بنی بیٹھی رہی تھی۔ غالباً یہ اُس کا پہلا تجربہ تو نہ تھا۔

سات پوس کے روز شانتی نکیتن کا جنم دن منایا جاتا ہے۔ یہ شانتی پوس برسوں سے ایک میلے کا رُوپ دھار چکا ہے۔ سمندر کی اُچھلتی ہوئی لہروں کی طرح سنتھال چھوکریاں اس ساحل پر آتی ہیں۔ اور اُن کے قہقہے آشرم کی خاموش فضا میں ہلچل پیدا کر دیتے ہیں۔

اپنی پنسل تیز کر لو، سُندرم!

ہاں بھائی، شانتی پوس آ گیا ایک سال بعد۔ آج میں نئی سکیچ بُک میں کام شروع کروں گا۔

پہلے کس کا سکیچ بناؤ گے؟

[1] ہم تو سنتھال نہیں بن سکتا۔

کسی ڈاڑھی والے کا۔

مَیں جو ہوں۔

لہروں کے ریلے ملاحظہ ہوں۔ ایک لہر میری اپنی بیوی ہے۔ سنتھال چھوکریوں کی دیکھا دیکھی اُس نے قدیم ڈھنگ کے گلٹ کے بنے ہوئے کانٹے خرید کر اپنے کانوں میں پہن لیئے ہیں۔ سنتھال عورتیں اسے دیکھتی ہیں اور عجب انداز سے مسکراتی ہیں۔ سُندرم نے جلدی جلدی اُس کا ایک سکیچ بنا ڈالا ہے۔

یہ سکیچ مجھے دے دو سُندرم بھائی!

نہیں یہ میرے پاس رہے گا۔

اب کویتا میری بیٹی اپنی ماں کا سکیچ لینے کے لئے ضد کر رہی ہے۔ سُندرم اس کے لئے اسی طرح کا دُوسرا سکیچ تیار کر رہا ہے۔ میرے ذہن میں ایک سنتھال گیت کے جذبات بیدار ہو رہے ہیں۔

"ماتا پتا ہیں چاند اور سُورج
بھائی بہن ہیں تارے سارے، سارے
سُورج کی کرنوں سے میں نے جنم لیا ہے۔
نام ہے سُورج مُکھی، پیارے!"

پہلے پہل کب یہ پھول کھل اُٹھا تھا؟ کیا یہ دھرتی کبھی اتنی بانجھ ہو جائے گی کہ یہ پھول کھلنے سے رہ جائیں؟ کیا میری اپنی بیوی بھی ایک سُورج مُکھی ہے؟

ماسٹر مہاشہ[1] آ رہے ہیں۔ بہت خوش نظر آتے ہیں۔ اِن انسانی لہروں کے ریلے یقیناً اُن کے دِل کے ساحل کو چھُو چھُو جاتے ہیں۔ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ مَیں نے اپنا کیمرہ کھول

---

[1] نند لال بوس۔ شانتی نکیتن میں کلا بھون (صیغۂ مصوّری) کے اُستادِ اعلیٰ اور بنگال اسکول کے ایک صفِ اوّل کے مصوّر۔

لیا ہے۔

ماسٹر جاشہ! اپنا فوٹو کھینچ لینے دیجئے آج۔

میرا فوٹو؟

جی ہاں!

اپنے مخصوص انداز سے وہ پھر کہہ اُٹھتے ہیں۔ میں تو اتنا سُندر نہیں۔ یوں ہی فلم خراب کر دوگے۔ کسی سنتھال لڑکی کا فوٹو کیوں نہیں لے لیتے؟

۲

کیا سوچ رہے ہو، پنڈت جی؟

کچھ نہیں۔

پنڈت ہزاری پرشاد دویدی[1] عمر میں مشکل سے مجھ سے ایک آدھ سال بڑے ہوں گے۔ مگر جنہوں نے کبھی انہیں دیکھا نہیں اُن کے مضامین پڑھ کر یہ سوچ لیتے ہیں کہ اُن کی عمر پچاس سے تو کیا کم ہوگی۔ شکر ہے مجھے یہ غلط فہمی نہ ہوئی تھی۔

پہلے پہل پنڈت جی مجھے کلکتہ میں ملے تھے۔ یہ کوئی آٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ اُس وقت بھی وہ یوں زور سے قہقہے لگایا کرتے تھے۔ جو آدمی اُن کی نگاہ میں نہ جنچے، اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہنے سے وہ اُس وقت بھی اُکتاتے نہ تھے۔

رات کو اُن کے لئے ایک پلنگ پر بستر لگایا گیا۔ اور خود میں ایک بڑی میز پر چادر بچھا کر لیٹ گیا۔ پنڈت جی میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے۔ آخر میں نے کہا "شاستروں میں برہمچاری کے لئے یہی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ نرم بستر پر نہ سوئے۔"

---

[1] شانتی نکیتن میں ہندی اور سنسکرت کے پروفیسر۔

شادی کے کچھ ہی ماہ بعد بیوی کو گھر چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ کسی طرح یہ سمجھنے لگا تھا کہ پھر سے برہمچاری بن گیا ہوں۔ اور پھر جب پنڈت جی کو پتہ چل گیا کہ میں شادی شدہ ہوں تو انہوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔

کیا سوچ رہے ہو، برہمچاری جی؟

کچھ نہیں۔

اکثر وہ تلوتما کو یاد کیا کرتے ہیں۔ اس اپسرا کے متعلق پورانوں میں یہ بتلایا گیا ہے کہ برہما نے جگہ جگہ سے تل تل بھر حسن جمع کیا اور پھر اس سے تلوتما کی تخلیق کی۔ پنڈت جی کا خیال ہے کہ اگر برہما نے صرف یہ مصالحہ ہی جمع کیا ہوتا اور یہ نہ سوچا ہوتا کہ آخر اس سے کس قسم کی چیز تیار کرنا ہوگی تو شاید یہ حسن کا ڈھیر بجائے خود دنیا کی ایک خوبصورت ترین چیز تصور کیا جاتا۔ اس اپسرا کے جنم کا حوالہ دے کر وہ کہا کرتے ہیں "دیہاتی گیت جمع کرنے والے ادیب کو چاہیئے کہ وہ بھی اپنی تلوتما کا تصور کرے۔" میں کہہ دیا کرتا ہوں "اپنی تلوتما کا تصور میں نے کر رکھا ہے، پنڈت جی!"

پنڈت جی یہ مانتے ہیں کہ کچھ دیہاتی گیت اتنے تاثر میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ کہ کالی داس اور بھوبھوتی بھی اُن کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں۔ سبھی گیتوں پر تو یہ بات لاگو نہیں ہوتی۔ وہ یہ دلیل دیا کرتے ہیں "عوام کا دل بھی گیتوں کو جنم دیتے وقت انہیں جذبات اور احساسات سے متاثر ہوتا ہے جن سے کالی داس اور بھوبھوتی متاثر ہوئے تھے۔ اسی طرح گھاس اور بانس قدرت کے ایک ہی شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر کوئی بھلا آدمی بانس کی جگہ گھاس کا استعمال نہیں کرے گا۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے پڑدی سنتھال لوگ قدیم موسیقی کے دلدادہ ہیں۔ ہم اُن سے پیار کر سکتے ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم خود بھی سنتھال

بن جائیں ۔ سنتھال بن کر ہم وقت کی ہتک کریں گے ۔ آج کی تہذیب کیا چاہتی ہے ؛ یہی نا کہ ہم نئے زمانہ کے ساتھ ساتھ چلیں ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں تو مَیں کہہ رہا تھا کہ دیہاتی گیتوں کے شاعر کالی داس، بھوبھوتی اور ٹیگور کی برادری ہی سے ہیں ۔ مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آج کا شاعر دیہاتی گیت لکھنے لگے اور کالی داس، بھوبھوتی اور ٹیگور سے منہ موڑ لے کیا یہ بات افسوس کرنے کے قابل نہیں کہ ہمارے کچھ نوجوان شاعر اب گیت لکھنے لگے ہیں تا کہ کھدر پرچار میں مدد دیں ؛ اور ہمارے کچھ ادیب اُن کے گیتوں کی تعریف بھی کرنے لگے ہیں"۔

جب بھی میں دیہاتی گیتوں کے بل پر عوام کے دکھ سکھ کا ذکر چھیڑتا ہوں، پنڈت جی بات کا رُخ بدل کر میرا دھیان اُس تہذیب کی طرف موڑ دیتے ہیں جو کہ اُن کے خیال کے مطابق قدیم آریوں کے ہندوستان میں آنے سے پیشتر اِس دیس میں موجود تھی ۔ مجھے ہنسی آجاتی ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی ترقی پسند ادیب اُن کی تقریریں سُنے تو ضرور انہیں رجعت پسندوں کی صف میں شمار کرنے لگے ۔

اپنی بات پنڈت جی یوں شروع کیا کرتے ہیں ۔ "دیہاتی گیتوں کی مدد سے ہم ایک پُرانی دُنیا کو حاصل کر لیں گے جسے یا تو ہم بھول چکے ہیں یا جسے ہم غلط سمجھ بیٹھے ہیں ۔ سیاسی حیثیت سے تو آریہ لوگ ہندوستان پر قابض ہو گئے تھے ۔ مگر اُس تہذیب کو جو یہاں پہلے سے موجود تھی اور اس وسیع ملک کے ہر حصّہ میں ذرا ذرا فرق کے ساتھ سانس لے رہی تھی آریہ لوگ بالکل مسخر نہ کر سکتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ آج بھی ہمارے عوام کے رسم و رواج میں آریوں سے پہلے کی اُس تہذیب کی کچھ نہ کچھ جھلک پائی جاتی ہے ۔ قدیم گیت اس تہذیب پر روشنی ڈال سکتے ہیں، محکمۂ آثارِ قدیمہ والوں کو اگر یہ بات بُری نہ لگے تو مَیں کہوں گا کہ قدیم دیہاتی گیتوں کی اہمیت موہنجو ڈارو جیسے کھنڈرات سے کہیں زیادہ ہے"۔

یہ سُن کر مَیں سوچنے لگتا ہوں کہ کیا یہ الفاظ اُنھی پنڈت جی کی زبان سے نکل رہے ہیں۔ جو کہا کرتے ہیں کہ سنتھالی بن کر ہم وقت کی ہتک کریں گے۔

ایک بار لتھوآنیا کا ایک پروفیسر شانتی نکیتن دیکھنے آیا تھا۔ اپنے لیکچر میں اُس نے بتایا کہ پچھلے پانچ سو برس سے اس کا ملک عیسائیت کے زیر اثر رہا ہے اور برابر آزادی کے لئے جدوجہد کرتا رہا ہے۔ عیسائی حکمرانوں نے پُرانے قومی ادب کو تباہ کر دیا۔ اب جب کہ اُسے آزادی مِل چکی ہے، وُہ اپنے قدیم قومی تمدّن کو پھر سے زندہ کرنا چاہتا ہے۔ لوگوں کے پاس صرف وہ گیت بچ پائے ہیں۔ جو صدیوں سے اُن کے ہونٹ چُومتے آئے ہیں۔ ان گیتوں کی روشنی میں لتھوآنیا اپنی کھوئی ہوئی دُنیا کو ڈھونڈ لینا چاہتا ہے۔ گیتوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ابھی کئی مجموعے تیار کئے جا رہے ہیں۔

پنڈت جی کہا کرتے ہیں کہ اُس پروفیسر نے اُنہیں بتلایا تھا کہ لتھوآنیا کی پُرانی تہذیب پر ہندوستانی تمدّن کا بہت اثر رہ چکا ہے۔ جب ایک شخص وہاں دوسرے شخص سے ملتا تھا تو "رام رام" (راما!) کہا کرتا تھا۔ اور جب کوئی مر جاتا تھا تو اُس کے رشتہ دار "رام نام ست" (راما!) کہا کرتے تھے۔ مجھے یہ نام سُن کر ہنسی آجاتی ہے، اور مَیں کہتا ہوں "لتھوآنین گیتوں پر کوئی کتاب انگریزی میں ضرور مِل جائے گی اور یہ سب باتیں میں دھیان سے پڑھوں گا، پنڈت جی!"

ایک بار پنڈت جی نے بھی اپنے گاؤں میں دیہاتی[1] گیتوں کا مطالعہ شروع کیا تھا۔ ماتا دیبی (شیتلا) کی پُوجا کے ایک گیت میں ایک بند ایسا بھی آتا تھا جس سے یہ پتہ چلا کہ ماتا دیبی کی شادی الی سیر (علی شیر) سے ہوئی تھی۔ یہ گیت لکھ کر اُنہوں نے اپنے ایک ہندو دوست

---

[1] یو پی کی بہار والی سرحد پر۔

کو دکھایا تو وہ بولا: "ہندو عورتوں کو یہ گیت گانے بند کر دینے چاہئیں۔" پھر جب یہ گیت منوموہن گھوش ایم۔ اے کو دکھایا گیا تو وہ بولے: "یہ الی سیر علی شیر کی بگڑی ہوئی صورت نہیں ہے بلکہ بُدھ مت کے کسی بھکشو کا نام معلوم ہوتا ہے۔ اس سے ملتا جلتا ایک نام میں نے بُدھ بھکشوؤں کے درمیان پایا بھی ہے۔"

پنڈت جی کہا کرتے ہیں، "کون کہہ سکتا ہے کہ 'الی سیر' کی واقفیت ہماری کسی عظیم تحقیق کی موجب نہیں ہوگی۔"

سنتھالی گیتوں کے بارے میں پنڈت جی دلچسپی سے سنتے سناتے ہیں۔ ایک بار وہ کھتی بابو[1] کے ہمراہ گھومنے نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ سنتھال عورتیں اپنے اپنے ہاتھ میں مشعل لیے گاتی چلی جا رہی ہیں۔ وہ دور نکل گئیں تو کھتی بابو نے پوچھا، "کہیئے کیا سنا" اور جب پنڈت جی نے بتلایا کہ گنگا پوجنے جاتی ہوئی عورتیں اُن کے اپنے گاؤں میں بھی اسی لے میں گایا کرتی ہیں تو کھتی بابو بولے۔ "گنگا آریوں کا لفظ نہیں ہے۔ اُن کے یہاں آنے سے پہلے بھی ہندوستان کی مقامی قوم میں رائج تھا۔ یہ سنتھال بھی اُسی قدیم قوم سے ہیں۔ آپ کے صوبے کی عورتوں نے گنگا پوجا کا وہ گیت کسی زمانے میں سنتھال عورتوں سے ہی سیکھا ہوگا۔"

میرے مجموعے میں پنڈت جی کو ایک گجراتی دُلہن کا المیہ گیت بہت پسند ہے۔ اُس بیچاری کا اپنا خاوند، ایک گھریلو غلط فہمی کی وجہ سے سونے کے کٹورے میں زہر گھول کر اُسے پلا دیتا ہے۔ سارے گیت پر غم کی فضا چھا رہی ہے۔" ایسا کوئی گیت سنتھالوں سے بھی ضرور ملنا چاہئے!" یہ کہتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں کھو جاتے ہیں۔

پنڈت جی اکثر کہا کرتے ہیں کہ کبھی کسی لاٹری میں انہیں پچھتر لاکھ روپے مل جائیں گے

---

[1] کشتی موہن سین۔ شانتی نکیتن میں ودیا بھون کے پرنسپل۔

پانچ لاکھ روپے مجھے دے دیں گے تاکہ دیہاتی گیتوں کے مجموعے خوبصورتی سے شائع کر سکوں۔ اور پچاس لاکھ روپے سے کہیں ہمالیہ پربت پر ایک دوسرے شانتی نکیتن کی بنیاد رکھیں گے اور باقی روپیہ اپنی ضرورتوں پر خرچ کیا کریں گے۔

"انہیں تنخواہ کم ملتی ہے۔ اس کا کافی حصہ پیچھے گھر بھیج دینا ہوتا ہے۔ رات کی نیند حرام کرتے ہیں۔ تب جا کر کچھ مضامین لکھ پاتے ہیں۔ اس سے کچھ بالائی آمدنی ہو جاتی ہے مگر انہیں یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں انتظامیہ کمیٹی یہ اعتراض نہ کرے کہ اتنے مضامین لکھنے والا پروفیسر کالج کا کام کیسے کر سکتا ہے۔

کلکتہ میں ترقی پسند ادیبوں کی آل انڈیا کانفرنس کا اجلاس ابھی ابھی ختم ہوا ہے۔ اگلے ہی روز جب اس کے صدر ڈاکٹر ملک راج آنند یہاں تشریف لائے تھے۔ پنڈت جی سے بھی ملے تھے۔ شروع میں ڈاکٹر آنند نے پنڈت جی کے سامنے ایک گھنٹہ تک اپنی بات جاری رکھی۔ پنڈت جی بُت بنے سنتے رہے۔ بیچ میں کچھ بھی بولیں گے تو یقیناً ریجیکٹ قرار دیئے جائیں گے۔ یہی ڈر لگا رہا۔

ادھر پنڈت جی کا یہ خیال ہو چلا ہے کہ اصلی ترقی پسند ادیب وہی ہے جو جب بھی کسی آدمی سے ملے، ایک گھنٹہ تک اپنی بات سناتا رہے، اور سننے والے کو اپنی زبان سے ایک بھی لفظ نہ کہنے دے۔

ترقی پسند ادیبوں کی اس کانفرنس کے سلسلے میں سنبا راؤ اور ریڈی بڑی طرح جھگڑ رہے ہیں۔ اس کی بھی ایک کہانی ہے۔

یہ دونوں لڑکے آندھرا دیس کے ہیں۔ ریڈی کالج کا کورس پورا کر چکا ہے اور اب سنگیت میں مہارت حاصل کر رہا ہے۔ سنبا راؤ ابھی سیکنڈ ایئر میں پڑھتا ہے جب

ڈاکٹر آنند کو معلوم ہُوا، کہ یہاں سے وہ ایک آدمی کو تیلگو ادب کی نشست کے لئے کانفرنس پر لے جا سکتے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔

ریڈی سے پُوچھا گیا، تو اُس نے جانے سے انکار کر دیا۔ بولا "میں ادیب ہی نہیں، ترقی پسند ادیب تو کجا!" مگر ستبا راؤ مان گیا۔

جب سے ستبا راؤ کانفرنس سے واپس آیا ہے اُس کی زندگی دوبھر ہوگئی ہے۔ ریڈی اُس کا مذاق اُڑاتا رہتا ہے۔ آج کچن میں ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی۔ ... ستبا راؤ کہہ رہا تھا — "ادب برائے ادب کا مسئلہ اب زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسے رجعت پسندوں نے جنم دیا تھا، جو زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنے کی بجائے رومان میں پناہ لیتے تھے۔"

... ریڈی بولا "تیلگو ادب پر براہِ راست کچھ کہو تو تمہاری لیاقت کا اندازہ لگاؤں۔ واہ! بغیر کچھ سمجھے بوجھے ترقی پسند ادیب بھی بن بیٹھے۔ کلکتہ کی کانفرنس میں تیلگو ادب کی نشست پر بیٹھ کر تم نے سارے آندھر دیس کی ہتک کی ہے۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا!" ... بس اسی پر ہاتھا پائی ہونے لگی۔

پنڈت جی کہہ رہے ہیں۔ اپنے شانتی نکیتن ہیں، جب ہم ہمالیہ پربت پر شروع کرنے والے ہیں اور جہاں سے آپ کے دیہاتی گیتوں کے مجموعے شائع ہوں گے۔ ہم ایسا انتظام کریں گے کہ ایسی ہاتھا پائی کبھی نہ ہُوا کرے!

میں کہتا ہوں — پنڈت جی! یہ ہاتھا پائیاں تو رہتی دُنیا تک جاری رہیں گی۔ ... چھوٹی ہاتھا پائیاں ... بڑی ہاتھا پائیاں!

۳

شانتی نکیتن کے میلے پر پچھلے سال سی۔ ایف۔ اینڈریوز صاحب سے پہلی بار ملاقات کا

شرف حاصل ہوا تھا - وہ یوں بغلگیر ہو کر ملے تھے جیسے کوئی باپ برسوں کے بچھڑے ہوئے بیٹے سے ملتا ہے - چاپنا بھون کی طرف اُن کے ساتھ جاتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ سبھی سے بغلگیر ہو کر ملتے ہیں - سامنے سے کوئی سنتھال آ جاتا، تو وہ اُسے بھی سینے سے لگا لیتے - مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں خود حضرت یسوع مسیح کے ہمراہ چل رہا ہوں-

اِس بار اُنہیں کلکتہ میں کام تھا - اس لئے وہ شانتی پَوش کے فوراً بعد یہاں سے چل دیئے - وہ کہہ رہے تھے - کون جانے اگلے شانتی پَوش پر تم کدھر ہو - میں کدھر ہوں- پچھلے سال کی طرح اب کے ہم پھر مل سکے، یہ کچھ کم بات ہے ... تمہارے کام سے مجھے بہت دلچسپی ہے - ہر کام ایک سادھنا مانگتا ہے، ایک دُھن، اور میں تو سمجھتا ہوں، کہ گاؤں والوں کے گیت بڑی خوبی کے ساتھ ہندوستان کا دھڑکتا ہوا دِل ہمارے سامنے لے آتے ہیں،

چلتے چلتے وہ کہہ گئے کہ میں اُنہیں اپنے کھینچے ہوئے فوٹو جلد بھیجوں - کرسمس کی صبح کو اُن کا جو فوٹو میں نے کھینچا تھا - اُس میں اُن کی بھرپور دلی خوشی کو دکھانے کی سعی کی گئی ہے - مجھے اُمید ہے کہ اُنہیں ایک دوسرا فوٹو اور بھی پسند آئے گا جس میں کویتا میری بیٹی اُن کی گود میں بیٹھی ہے - اُنہوں نے بتلایا تھا کہ بچوں سے اُنہیں سدا محبت رہی ہے -

انسانی لہروں کے وہ زبردست ریلے اب نظر نہیں آتے - پانتھ نواس کے سامنے والی سڑک پر پھر وہی خاموشی چھا رہی ہے -

دُور سے بنسری کی لے کان تک پہنچتی ہے اور وقت گزرتا رہتا ہے پل پل کر کے -

صبح، دوپہر، شام -

حال ماضی بن جاتا ہے - مستقبل حال بن جاتا ہے - گانے سے پیٹ تو نہیں بھرتا -

مگر گانا بھی ضروری ہے۔ صدیوں سے یہ نبسری کانپتے ڈگمگاتے آدمی کا سہارا رہی ہے۔ صدیوں سے وہ کبھی سوئی نہیں۔ یہ یہاں نہ ہوتی تو شانتی نکیتن کی بہت ساری سندرتا پھیکی پڑ جاتی۔ اور میں تو سمجھتا ہوں گورودیو[1] کی شاعری بھی اس سے متاثر ہوئی ہے۔

آسام سے لوٹ کر دارجلنگ میں گورودیو سے ملا تھا تو میری آٹوگراف بک میں انہوں نے یہ الفاظ لکھ دیئے تھے۔

"اے دُنیا کی ننھی خانہ بدوش ہستیو!

میرے لفظوں میں چھوڑ جاؤ اپنا کھوج"۔

میں سوچنے لگا تھا کہ اُن سنتھالوں نے بھی، جو اٹھارہویں صدی کے آخری دنوں میں شانتی نکیتن کے پاس دیہات میں آ بسے تھے اور جو روز اُس سڑک پر چلتے ہیں جو بانسوں کے سامنے سے گزرتی ہے گورودیو کی شاعری میں ضرور اپنا کھوج چھوڑا ہوگا۔

کل ہی کی بات ہے۔ میں گورودیو کو اپنے کھینچے ہوئے فوٹو دکھا رہا تھا۔ ایک سنتھال چھوکری کی پورٹریٹ پر اُن کا دھیان جم گیا۔ میں نے پوچھا "آپ کو یہ چیز پسند آئی؟"

"ہاں" وہ بولے "اس کا نام ہونا چاہیئے، دھرتی کی بیٹی۔ کس طرح اپنی لاج بھری آنکھیں جھکا رکھی ہیں اس نے۔ یہ لاج تو کھیتوں کی لاج ہے جو دھان کی طرح اُگتی ہے ...... ضرور وہ دھرتی کی بیٹی ہے"۔

"تو اسے آپ رکھ لیجیے" میں نے خوش ہو کر کہا۔

گورودیو نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور تصویر اپنے سکریٹری کے سپرد کر دی۔

"میں تو سمجھتا ہوں" میں نے کہا "کہ وہ سنتھال لڑکی جس نے اپنے گیت میں دریا کنارے

---

[1] رابندرناتھ ٹیگور

کی چٹان تلے سوئے ہوئے پانی سے اپنے پیار کو تشبیہ دی ہے اور کسی نوجوان کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ وہ بنسری نہ بجائے تاکہ یہ سویا ہوا پانی بیدار نہ ہو جائے۔ ضرور کوئی ایسی ہی کنواری ہوگی ... پر بنسری تو سوئے ہوئے پانی کو جگا کر چھوڑتی ہے ...."

"میرا بھی یہی خیال ہے"۔ گرودیو بولے۔

اُترائن[1] کے دروازے سے ذرا پرے سڑک کے کنارے کنکروا[2] سیمنٹ کنکریٹ سے دو تین قدِ آدم بُت بنوا رہے ہیں۔ ایک سنتھال عورت نے سر پر ٹوکرا اُٹھا رکھا ہے۔ ایک مرد بہنگی اُٹھائے ہوئے ہے۔ پاس اُن کا کُتا حکم میں بندھے ہوئے خوددار آدمی کی طرح کھڑا ہے۔ پہلے کاٹھ کے ڈھانچے کھڑے کئے گئے تھے۔ اب سیمنٹ کنکریٹ سے کام کیا جا رہا ہے۔ جب یہ چیز مکمل ہو جائے گی تو آشرم کی سُندرتا میں خاص اضافہ ہو جائے گا۔ پرے دیہات سے آتے ہوئے سنتھال صبح کی روشنی میں دُور سے ان بُتوں کو دیکھ کر کیا سوچا کریں گے، یہی سوچ رہا ہوں۔ دِل کہتا ہے کہ یہ چیز تو آج سے بہت پہلے تیار ہو جانی چاہئے تھی۔

کِنکروا کہہ رہے ہیں، یہ بُت زیادہ فنش نہیں کئے جائیں گے۔ ویسی ہی سادہ اور کھُردری حالت میں رہیں گے، جیسے کہ آج سے کئی سال پیشتر ایک اپسرا کے بُت میں تجربہ کیا گیا تھا جو کہ اب بھی کلا بھون ہوسٹل کے قریب کھڑا ہے۔

میں کہتا ہوں — دیوتاؤں اور اپسراؤں کے سُندر بُت تو بہت بنائے گئے۔ مگر خود دھرتی کے باسیوں کی یہ نمائندگی الگ اہمیت رکھتی ہے۔

---

[1] شاعر ٹیگور کے صاحبزادے کا مکان۔ اسی کے احاطہ میں خود شاعر ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے ہیں۔

[2] شانتی نکیتن میں کلا بھون کے ایک آرٹسٹ۔ دادا بنگالی میں بڑے بھائی کو کہتے ہیں۔ "دا" اسی کا مخفف ہے۔

دُور سے سنتھال بنسری کے سُر قریب آنے لگتے ہیں۔ میرے ذہن میں وہی پُرانا گیت جاگ اُٹھتا ہے جو بارہ سال پیشتر پہلی بار ادھر آنے پر سُنا تھا ــــ کیا ہیں آخر ہم سب مِل کر، ہم سب مِل کر؟ ..... اَن گِنت درختوں کا اِک جھُرمٹ!

بجائے جاؤ بنسری، بھولے سنتھالو! گائے جاؤ نغمے نئے پُرانے۔ گانا بھی ضروری ہے۔ صدیوں کا بوجھ جو جھیلنا ہوتا ہے۔ تمہارے گیتوں میں گاتی ہے دھرتی ماتا۔ اچھی قدیم دھرتی ماتا۔ مگر زندگی سے لڑنا ہوگا اپنے بل پر۔ دب کر نہ رہ جانا۔ کون کھاتا ہے ترس کِسی پر؟ .....

ہائے! زندگی کی تلخ حقیقتیں! .....

شانتی نکیتن (بنگال)

جنوری ۱۹۳۹ء

"بھین بھرا دے گیت"[1]

سنہ ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال نے ایک ملاقات کے دوران میں کہا تھا۔ "پنجابی بولی اس وقت علمی زبان نہیں۔ اس میں نثر بہت کم ہے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ نثر کے لکھے جانے سے یہ علمی زبان نہ بن سکے۔ پنجابی میں جب گنوارپن[2] بہت ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ رہی ہے کہ عام طور پر کم پڑھے لکھے لوگ اسے پڑھتے لکھتے رہے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں کی ہمت سے اس میں لطافت اور نزاکت پیدا کی جا سکتی ہے۔ پنجابی میں بندش اور صحت الفاظ پر بہت کم زور دیا جاتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ بحروں کا لحاظ قائم نہیں رہتا۔ بہاولپور کے احمد یار نے تھوڑی بہت ہمت کی ہے۔ اس کا دعوے ہے کہ مجھ سے پہلے کسی نے بحر، قافیے اور ردیف کا اتنا خیال نہیں رکھا۔ پنجابی شاعری بڑی بڑھیا شاعری ہے، اور خاص طور پہ جب

---

[1] بہن بھائی کے گیت جنہیں پنجابی لڑکیاں اور عورتیں گاتی ہیں۔

[2] گنوار پن۔

سے بھیگی ہوئی ہے ۔ پنجابی شاعری کی زبان بڑی سیدھی سادی، نرم نرم اور میٹھی ہوتی ہے جذبات سچّے ہوتے ہیں اور بڑے کھُلے الفاظ میں بیان کیئے جاتے ہیں ۔ لیکن تشبیہوں میں بعض اوقات مذاق پست ہو جاتا ہے . . . . عشق کے رموز پنجابی میں خوب بیان کیئے جا سکتے ہیں ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پنجابی شاعری میں صرف مجازی عشق ہوتا ہے ۔ نہیں، بلکہ عشق حقیقی زیادہ ہوتا ہے ۔ پنجابی شاعری تصوّف سے بھری ہوئی ہے ۔ یہاں تک کہ بعض اوقات یوں معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی شاعری میں تصوّف کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا ۔ پنجابی شاعری میں ایک اور خصوصیت ہے ۔ اس میں وطن کی محبت کے متعلق بڑے پر جوش گیت ملتے ہیں ۔ فوجی گیتوں کی بھی کمی نہیں ۔ عام لوگوں کے گیتوں اور بولیوں کی تو کوئی حد ہی نہیں ۔ اُردو میں تصوّف کی شاعری ہے ہی نہیں ۔ صرف ایک میر درد کا نام لیا جا سکتا ہے ۔ اُردو میں وطن کی محبت کی شاعری اور فوجی گیت بھی نہیں ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو شاعری دربارِوں اور امیروں اور مصاحبوں کے ہاتھوں میں پلی پھولی ہے ۔ وہ لوگ یا تو ایرانی تھے یا ایرانی مذاق کو پسند کرتے تھے ۔ اُن کا میل جول عام آدمیوں سے نہیں تھا ۔ اسی وجہ سے اُردو شاعری میں امیرانہ رنگت آگئی ہے ۔ وہ شعر کہنے کو ایک فیشن سمجھتے تھے ۔ شعر گوئی پر قدرت حاصل کرنا ہی شاعری کی خوبی سمجھی جاتی تھی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اوقات صرف بحر، قافئے اور ردیف کی خاطر بناوٹی جذبے اور بناوٹی خیال گھڑنے کی ضرورت پڑتی تھی ۔ لیکن پنجابی کے لئے اُردو کی خوبیوں کی ضرورت ہے ۔ پنجابی شاعروں کو اُردو شاعروں کی طرح زبان، (خیالات و الفاظ کی تراش خراش اور بناوٹ) پر قدرت حاصل کرنی چاہیئے ۔ اور اُردو شاعری کی قوت اور پاکیزگی پنجابی شاعری میں پیدا کرنی چاہیئے "۔

لے ایس ایل پراشر: سر اقبال دے نال ہل ۔ پیر خانے دے اندر (سر اقبال سے ملاقات ۔ پیر خانے کے اندر) پنجابی رسالہ سارنگ دسمبر ۱۹۴۳ء ۔ اس مقالے کا لفظی ترجمہ جس سے یہ اقتباس لیا گیا ہے ہمایوں اگست ۱۹۴۶ء میں شائع ہو چکا ہے ۔

اسی موقع پر مُلا قاقی کی زبان سے یہ سُن کر کہا ہمیں تو بلا افسوس ہے کہ آپ کے سے جاننے اور ماننے ہوئے پنجابی نے اپنی زبان میں نہیں لکھا۔ پنجابی کو تو آپ جیسے آدمی کی ضرورت تھی جس طرح گوئٹے نے اپنے وقت کی بے حقیقت جرمن بولی کو ایک مسلّم عظیم الشان زبان بنا دیا تھا، اُسی طرح آپ بھی پنجابی زبان کو ترقی دے سکتے تھے۔" علامہ اقبال نے فرمایا تھا: "کوئی بولی جب ہی ایک زبردست شخصیت اُسے بنا سکتی ہے اور کوئی تعجب کی بات نہیں کہ پنجابی کو بھی گوئٹے جیسا آدمی مل جائے۔"

اسی موقع پر علامہ اقبال نے مصنف کی اپنی زبان کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے فرمایا تھا: "اس ناول یا ڈراما لکھنے کے لئے لوگوں کی زبان استعمال کرنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی شخص پنجابی ناول یا ڈراما لکھنا چاہے تو کیا حرج ہے اگر وہ پنجابی میں لکھے۔"

پچھلے پندرہ برس میں پنجابی ادب تیزی سے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں شریک ہو گیا ہے۔ کئی صاحب طرز نثر نگاروں کی بدولت نہ صرف اظہارِ خیال میں نئی وسعتیں پیدا ہو گئی ہیں بلکہ ہمسایہ زبانوں کا ادب بھی اس کی نشوونما میں شریکِ کار ہوا ہے۔ جوکہ گیتوں کی تجدید میں بہت سے پنجابی ادیب خاص طور پر حصہ لے رہے ہیں۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہن کی محبت کے ایسے پُرخلوص لوک گیت بہت کم زبانوں میں ملتے ہیں۔ بہت سی زبانوں کی شاعری میں تو یہ چیز سرے سے غائب ہے۔ پنجابی زبان میں ماں بیٹی کے گیت گائے جاتے ہیں۔ ساس بہو کے گیت الگ حیثیت رکھتے ہیں، نند بھابی کے گیتوں میں الگ شوخی اور بے باکی ملتی ہے۔ بہن بھائی کے گیت ہر اعتبار سے بڑھ چڑھ کر ہیں، جو گویا یہ سماجی زندگی سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ نظر آتے ہیں جیسا کہ ایک ادیب نے تسلیم کیا ہے:

"جس زمانہ میں یہ گیت تیار ہوئے، اُس زمانہ میں پنجابی عورت کی زندگی آج کل سے بہت مختلف تھی۔ کوئی غیر معمولی حالات نہ تھے۔ پیدا ہوئی، کھیلی کودی۔ جوان ہوئی تو بیاہی گئی۔ شوہر [illegible]

چلا گیا۔ دُلھن ساس سُسر کے پاس رہ گئی۔ ساس سُسر انتہا درجہ کے مظالم روا رکھتے تھے۔ نئی نویلی دُلھن آٹا پیستی تھی اور چرخہ کاتتی تھی۔ اِس ہجر و ملال کے دِنوں میں اُسے پیا پردیسی پیا یاد آتا تھا یا اپنے ماں باپ اور بھائی۔ پیا کو کھلم کھلا یاد کرنا مشکل تھا۔ ساس اور نند کہتی: کتنی بےحیا ہو گئی ہے۔ غریب کے پاس دل کا بخار نکالنے کا ایک ہی ذریعہ تھا۔ عالمِ خیال میں بھائی کو اپنے سامنے بُلاتی اور اُس سے اپنی جدائی کی مصیبتوں کا حال بیان کرتی۔ کبھی کبھی موقع ملتا تو شوہر سے بھی گفتگو ہو جاتی۔ اور اس طرح یہ گیت عالمِ وجود میں آئے۔ گیتوں میں نہ لفظوں کی خوبصورتی ہے نہ عروض کی پابندیاں ہیں۔ لیکن ان میں مظلوم بہن کا دِل چھپا ہے۔ اس میں عورت کے جذبات بھرے ہیں۔ جب عورت نے دیکھا کہ کوئی اُس کی پکار نہیں سُنتا، نہ کوئی شخص اُس کی آنکھ کے آنسو دیکھتا ہے۔ تو اُس نے اپنی زبان کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ لئے اور اُن میں اپنے دِل کی آگ بھر دی۔ اور یہ وُہ شے ہے جو بڑے بڑے شاعروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔[1]"

آج بھی پنجابی دیہات میں عورت کی زندگی میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا۔ آج بھی شوہر کی شرافت کا یہی معیار سمجھا جاتا ہے کہ وہ بیوی کی حمایت میں ماں باپ کے مُنہ نہ آئے۔ اِسی سخت گیری کے پیشِ نظر کوئی کوئی لڑکی موت کو سُسرال کی زندگی پر ترجیح دینے کا قصد کر لیتی ہے۔ آج بھی ننھی ننھی لڑکیاں تک کہہ اُٹھتی ہیں — "جیوے میرا ویر پیار" یعنی بھائی کے لئے میرا پیار زندہ رہے۔ ساون کے شروع ہوتے ہی سُسرال کی زندگی اور بھی دوبھر محسوس ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ انہی دِنوں میکے جانے کی رُت قریب نظر آتی ہے اور بہن بڑی شدت سے بھائی کا انتظار کرتی ہے۔

[1] سُدرشن، "بہن بھائیوں کے گیت"، چندن، اپریل ۱۹۳۲ء

بہن بھائی کے گیت ترنجن ٭ میں گائے جاتے ہیں یا جھولے پر۔ ان میں کہیں سسرال اور میکے کا تضاد بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک ہی مرکزی خیال کے باوجود ہر گیت کا اپنا رنگ، اپنا انداز۔

گیتوں میں بھائی کے لئے "ویر" کا لفظ زیادہ موزوں سمجھا گیا ہے۔ "ویر" خالص سنسکرت لفظ ہے۔ اس کے لفظی معنی بہادر یا جوانمرد ہوتے ہیں۔ اس میں پہلے وقتوں کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ جبکہ رن بھومی کو جاتے ہوئے سورما کے ماتھے پر بہن اپنے ہاتھ سے تلک لگاتی تھی۔ بھائی کا سب سے بڑا فرض بہن کی حفاظت سمجھا جاتا تھا۔

آج بھی پنجابی بہن گاتی ہے:—

"کالی ڈانگ میرے ویر دی
جتھے وجدی بدل وانگوں گجدی"

— میرے بھائی کی لاٹھی کالے رنگ کی ہے
جہاں بھی وہ اس سے وار کرتا ہے، یہ بادل کی طرح گرجتی ہے۔

پنجابی لوک گیتوں میں باپ کو "دھرمی بابل" کہا گیا ہے۔ غریب کی بیٹی بھی اپنے باپ کو "لکھ داتا" سمجھتی ہے۔ "ماں رانی" وہ پسند کی گئی ہے جس کے روبرو بیٹی اپنے دکھ سکھ کی کہانی بلاتکلف سنا سکے۔ اور بھائی کی سب سے بڑی صفت یقیناً اس کی جوانمردی ہی تصور کی گئی ہے۔

سسرال میں لڑکی ہمیشہ ماں جائے بھائی کی آمد کے خواب دیکھتی ہے۔ اس کے معصوم پیار میں تصنع اور بناوٹ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

٭ چرخہ کاتنے والیوں کی محفل

بھائی کو بہن کے حالات کا پتہ کیسے چلے؟ کس کے ہاتھ پیغام بھیجا جائے؟ انسان کی دُنیا سے مایوس ہو کر وہ اُڑتے ہوئے کوّے سے مخاطب ہوتی ہے:۔

اُڈ داتے جائیں کانواں! بہندا بھی جائیں
بہندا جائیں میرے پیو کڑے
اِک نہ دسّیں میری ماں رانی نوں
رُووگی اڑیا میریاں گڈیاں ویکھ کے مَیں واری
اِک نہ دسّیں میری بہن پیاری نوں
رُووگی اڑیا بھریا ترنجن ویکھ کے مَیں واری
اِک نہ دسّیں میری بھابی نوں
کھِر دکھِڑ ہسُوگی اڑیا پیو کڑے جا کے مَیں واری
اِک نہ دسّیں میرے دھرمی بابل نوں
رُووگا اڑیا بھری کچہری چھوڈ کے مَیں واری
دسّیں وے کانواں میرے ویر پیارے نوں
آؤگا اڑیا نیلا گھوڑا پیڑ کے مَیں واری

ترجمہ:۔ اے کوّے! اُڑتے ہوئے جائیو، بیٹھتے ہوئے جائیو
بیٹھتے ہوئے میرے میکے تک پہنچ جائیو
میری ماں رانی سے میرے حالات نہ کہیو
وہ بے چاری، میری گڑیاں دیکھ دیکھ کر آنسو بہائے گی۔ مَیں تیرے صدقے جاؤں
میری پیاری بہن سے کچھ مت کہیو۔

بھرپور ترنجن دیکھ کر وہ رووے گی۔ مَیں تیرے صدقے جاؤں

میری بھاوج سے کبھی کچھ مت کہیو

وہ اپنے میکے جا کر بُری طرح میرا مذاق اُڑائے گی، مَیں تیرے صدقے جاؤں

میرے دھرمی باپ سے بھی کچھ مت کہیو

بھری کچہری سے باہر آکر وہ رونے لگ جائے گا۔ مَیں تیرے صدقے جاؤں۔

اے کوّے! میری کہانی تو میرے بھیاہی سے کہیو۔

سُنتے ہی وہ نیلے گھوڑے پر سوار ہو کر میرے پاس پہنچے گا۔ مَیں تیرے صدقے جاؤں۔

لیکن بہت جلد اُسے معلوم ہو جاتا ہے کہ کوّا یہ کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ چنانچہ وہ اپنے میکے کی طرف جاتے ہوئے کسی راہی سے کہتی ہے:۔

بھائیا راہیا جاندیا! جانائیں توں کیہڑے دیس، مَیں واری

جانائیں بی بی! تیرے پیوکڑے، اوسے سنبھالے جاواں، مَیں واری

جا آکھنا میری ماں رانی نوں، دِھیّاں کیوں دِتّیاں دُور، مَیں واری!

مَیں نہ دِتّیاں دُور، کِدھرے دِتّیاں اُنہاں دے باپ، مَیں واری!

بابل کُرسی بیٹھیا دے دِھیّاں کیوں دِتّیاں دُور، مَیں واری!

مَیں نہ دِتّیاں دُور کِدھرے دِتّیاں اُنہاں دے وِیر، مَیں واری!

سُنیں دے وِیرا راجیا! بھیناں کیوں دِتّیاں دُور، مَیں واری

مَیں نہ دِتّیاں دُور کِدھرے دِتّیاں اُنہاں دے لیکھ، مَیں واری

اَج بناواں پِنّیاں، بھلکے سُوہیاں چُنّیاں، پرسوں بھیناں دے دیس، مَیں واری!

جاندا وِہڑے جاوڑیا، ڈُھل پئے بھیناں دے نَین، مَیں واری

سِردا چیرا باڑ کے نُوںہجاں بھیناں دے نَین، مَیں واری !

سستی پہاوے حکیّاں، سوہرا گھٹاوے بھنگ، مَیں واری !

بھنگ دا بُوٹا ٹُٹ سُٹاں، چکّی دے ٹُوٹے چار۔ مَیں واری !

سس نے لاہ لئیاں چندوڑیاں، سوہرے نے لاہ لے بند، مَیں واری !

نیلا گھوڑا وِچ کے بنا دیاں بھیناں نوں بند، مَیں واری !

گل دا کنٹھہ وِچ کے بنا دیاں بھیناں نوں چند، مَیں واری !

ترجمہ :۔

بہن :۔ اے راہ چلتے بھائی مسافر! تم کس دیس کو جا رہے ہو، مَیں صدقے جاؤں

داھی :۔ مَیں تیرے میکے جا رہا ہوں بی بی! کوئی پیغام ہو تو دے دو۔ مَیں صدقے جاؤں

بہن :۔ میری ماں رانی سے پُوچھیو کہ اُس نے اپنی بیٹی کو اِتنی دُور کیوں بیاہ دیا ہے؟ مَیں صدقے جاؤں۔

ماں :۔ مَیں نے تو اُسے اتنی دور نہیں بیاہا۔ اُس کے باپ نے اُسے اتنی دُور دے دیا۔ مَیں صدقے جاؤں۔

داھی :۔ اے کرسی پر بیٹھے ہوئے باپ۔ تُو نے اپنی بیٹی کو اتنی دُور کیوں بیاہ دیا؟ مَیں صدقے جاؤں

باپ :۔ مَیں نے اپنی بیٹی کو اِتنی دُور نہیں بیاہا۔ اُس کے بھائی نے اُسے اِتنی دُور دے دیا۔ مَیں صدقے جاؤں۔

داھی :۔ سنو تو راجہ بھائی، بتاؤ تم نے اپنی بہن کو پردیس میں کیوں بیاہ دیا؟ مَیں صدقے جاؤں۔

بھائی :۔ مَیں نے تو بہن کا بیاہ اتنی دُور نہیں کیا۔ یہ تو اُس کی اپنی تقدیر ہے۔ مَیں صدقے جاؤں۔

آج مَیں اپنی بہن کے لئے پنیاں[1] بناؤں گا۔ کل کو اُس کے لئے سُرخ چُنری رنگاؤں گا اور پرسوں بہن کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ مَیں صدقے جاؤں۔

[1] ایک طرح کے لڈو

"چلتا چلتا بھائی بہن کے آنگن میں جا پہنچا بہن کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ میں صدقے جاؤں"۔
سر کی پگڑی پھاڑ کر میں بہن کے آنسو پونچھ رہا ہوں۔ میں صدقے جاؤں۔

بہن:۔ ساس مجھ سے چکی پسواتی ہے اور سسر مجھ سے بھنگ رگڑواتا ہے۔ میں صدقے جاؤں۔

بھائی:۔ میں بھنگ کا بوٹا اکھاڑ کر پھینک دوں گا اور چکی کے چار ٹکڑے کر دوں گا۔ میں صدقے جاؤں"

بہن:۔ ساس نے میرے سر سے چنڈوڑیاں[1] اُتار لیں اور سسر نے میرے ہاتھوں سے بند[2] اُتار لئے۔
میں صدقے جاؤں۔

بھائی:۔ نیلا گھوڑا بیچ کر میں بہن کے لئے "بند" بنوا دوں گا۔ میں صدقے جاؤں ــــ گلے کا کنٹھا بیچ کر میں بہن کے لئے چنڈ[3] بنوا دوں گا۔

پنجابی دُلہن کے پاس شعر و نغمہ کا ورثہ موجود ہے۔ زندگی کے شیریں و تلخ دونوں رُخ اُس کے سامنے آتے ہیں، اور اُسے ہنسنے اور رونے پر مجبور کرتے ہیں۔ اُس کا ہر گیت ہمارے دِل تک پہنچتا ہے اور ہم یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ شعر و نغمہ کے ایسے گیت ہندوستان کے سبھی صُوبوں میں رائج ہیں۔ یُوپی کا ایک گیت ملاحظہ ہو:۔

بہن:۔ کبھی میرے دیس میں بھی آؤ بھیا! آؤ اور میرا دُکھ سُکھ سُنو۔

بھائی:۔ کیسے آؤں تیرے دیس میں بہن؛ تیرے دیس میں تو ڈھاک کے گھنے جنگل ہیں۔
اور اُن میں شیر بستے ہیں۔

بہن: اپنے ہاتھوں میں ڈھال اور تلوار لے کر آؤ بھیا! شیر تمہارا کیا بگاڑ سکتے ہیں؛

× × ×

میں دو گھڑ سواروں کو اپنی طرف آتے دیکھ رہی ہوں۔ ایک گورا ہے دُوسرا سانولا۔

[1] [2] [3] مختلف قسم کے زیور۔

گورا میرا اماں جایا بھیا ہے اور سانولا میری نند کا بھیا۔

ساس جی: بتاؤ ان کے لئے میں کیا کیا پکوان پکاؤں؟

ساس: کوٹھے میں گلی سڑی کودوں پڑی ہے اور دیوار پر مسوڑے کا ساگ رکھا ہے۔

دلہن: گلی سڑی کودوں کو آگ لگے ساس جی! اور مسوڑے کے ساگ پر بجلی گرے۔

× × ×

میدا چھان کر دلہن نے پوریاں تیار کیں۔ بتھوے کا ساگ بنایا، مونگ کی دال پکائی، اور موتی جیسے چاول لے کر بھات تیار کیا۔

سونے کی تھالی میں بھوجن پروس کر اوپر سے گھی ڈال دیا۔

سالا اور بہنوئی کھانے بیٹھے۔ سالے کی آنکھوں میں اچانک آنسو آ گئے۔

× × ×

بہن۔ ذرا تم مالن کے "اوسارے" میں تو جا کر بیٹھو بھیا! مالن کی بیٹی تم سے میرا سب حال کہہ دے گی۔ وہ تمہیں بتائے گی کہ میں کے من اناج روز کوٹتی ہوں، کے من پیستی ہوں اور کے من پکاتی ہوں۔

میری ساس بڑی ظالم ہے۔ وہ مجھے ٹوکرا بھر برتن صاف کرنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔

اُس کے حکم سے مجھے گہرے کنوؤں سے پانی لانا پڑتا ہے۔

میں سب کو کھلاتی ہوں، پھر جو بچ رہتا ہے مجھے ملتا ہے۔ اس میں سے بھی چرواہا اپنا حصّہ الگ لے جاتا ہے۔

پہننے کی بھی کچھ نہ پوچھو، پھٹے پرانے کپڑے جو گھر والے اُتار ڈالیں میں پہن لیتی ہوں۔

ا؎ ایک اناج

بھائی:۔ لوہا لوہار کی بھٹی میں جل رہا ہے! میری بہن سسرال میں جل رہی ہے!

بہن:۔ میرا یہ دکھ میری بھاوج سے نہ کہیو بھیا! وہ گھر گھر میرا مذاق اڑاتی پھرے گی!

میری ماں سے بھی نہ کہیو۔ وہ بیچاری چھاتی پھاڑ کر مر جائے گی۔

میری چچی سے بھی میرے دکھوں کا ذکر نہ کیجیو۔ اس کے طعنے میں نہ سہار سکوں گی۔

میرے بابا کو بھی اس کی خبر نہ ہونے پائے۔ پنچایت میں بیٹھ کر وہ آنسو بہائے گا۔

میرا یہ دکھ اس سے کہیو جس نے یہ رشتہ طے کرایا تھا۔ اس برہمن سے کہیو جس نے میرا بیاہ پڑھوایا تھا۔

مگر اچھا ہو گا کہ میرا دکھ درد تو کسی سے بھی نہ کہے بھیا!

میرے دکھ درد کو ایک گٹھڑی میں باندھ کر لے جائیو بھیا اور راستہ میں یہ گٹھڑی دریا میں پھینکتے جائیو۔

پنچایت میں بیٹھا بابا دیکھتا ہے کہ بیٹا تو آ رہا ہے مگر بیٹی ساتھ نہیں ہے۔

بہن کے بھائی نے گھر آ کر کہا۔ جیسے جمنا امڈ کر بہتی ہے اسی طرح میری بہن سسرال میں روتی ہے

باپ: کیا تیری جانگھ تھک گئی تھی بیٹا: کیا تیرے بازوؤں میں ذرا بھی ہمت باقی نہ رہی تھی؟

اپنی دکھی بہن کو تو وہاں کیوں چھوڑ آیا؟

لڑکی کا دل سسرال سے میکے جانے کے لئے تڑپ اٹھتا ہے جہاں وہ پیدا ہوئی اور آزاد ہوا میں جوان ہوئی جب وہ سمجھتی ہے کہ سسرال میں اس کی خودداری قائم نہیں

بکتی۔ تو وہ اپنے جذبات کی دنیا میں اڑتی ہے اور اپنے بھائی سے فریاد کرتی ہے۔

ایک گیت میں بھائی کو بہن کے دروازے کے سامنے سے اپنے دوستوں سمیت گزرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ بہن اس کی یہ بے رُخی برداشت نہیں کر سکتی۔ بھائی نے بہت بہانے کئے لیکن بہن نے ایک ایک بات کا جواب بڑے پیار سے دیا۔

ویرا! گھر گھر دھریکاں پھُلیاں
چندا! گھر گھر دھریکاں پھُلیاں
اینہاں دھریکاں دی ٹھنڈی چھاؤں
ویرا! وے توں آ گھرے
لے چل ماپیو دے دیس وے ویرا آ گھرے
کیکن آواں بھینے بھو لئے ؟
کیکن آواں بی بی بھو لئے ؟
میرے ساتھی تاں لنگھ گئے دُور
بھینے نی! تُوں رہ گھرے
رہ گھر سس تے جی دے کول نی! بھینے! رہ گھرے
تیرے ساتھیاں نوں منجے پیڑھیاں
چندا! ساتھیاں نوں منجے پیڑھیاں
اپنے ویرے لئی پلنگ بچھاواں
ویرا وے تُوں آ گھرے!
لے چل ماں پیو دے دیس وے ویرا! آ گھرے

تیرے ساتھیاں نُوں گھیو کھچڑی
چندا! ساتھیاں نُوں گھیو کھچڑی
آپنے ویر نوں گری اے چھوہارا
ویرا وے توں آ گھرے
لے چل ماں پیو دے دیس وے ویرا! آ گھرے
بھینے! اگے تاں دُھپاں کرڑیاں
بی بی! اگے تاں دُھپاں کرڑیاں
اِک دُھپ لگے مر جائیں
بھینے نی تُوں رہ گھرے
رہ گھر سس توں جی دے کول نی بھینے! رہ گھرے
ویرا! تمبیاں بناواں مَیں چھتریاں
چندا! تمبیاں بناواں مَیں چھتریاں
اپنے ویرے نوں چھاؤں کراں
ویرا وے توں آ گھرے
لے چل ماں پیو دے دیس وے ویرا! آ گھرے
بھینے! اگے تاں ندیاں ڈونگھیاں
بی بی! اگے تاں ندیاں ڈونگھیاں
اِک ڈوب لگے مر جائیں
بھینے نی توں رہ گھرے

رہ گھر سستو جی دے کول نی بھینے! رہ گھرے
ویرا! نمیاں بناواں میں بیڑیاں
چندرا! نمیاں بناواں میں بیڑیاں
اپنے ویرے نوں پار لنگھاواں
ویرا! وے توں آ گھرے
لے چل ماں پیو دے کول وے ویرا! آ گھرے
بھینے! اگے تاں سولاں ترکھیاں
بی بی! اگے تاں سولاں ترکھیاں
اِک سول چبھے مر جائیں
بھینے! نی توں رہ گھرے
رہ گھر سستو جی دے کول نی بھینے! رہ گھرے
ویرا! نمیاں سلاواں میں جُتیاں
ویرا! نمیاں سلاواں میں جُتیاں
میں تاں ٹھُم ٹھُم کردی جاواں
ویرا! وے توں آ گھرے
لے چل ماں پیو دے دیس وے ویرا! آ گھرے
بھینے! اگے تاں کُتے بھونکدے
بی بی! اگے تاں کُتے بھونکدے
اِک دند لگے مر جائیں

١٩٣٦ء

گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں چھپی اور شری دیوندر ستیارتھی
پرنٹر و پبلشر نے جنتا جنتا، سنت نگر لاہور سے شائع کی